تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

ماہنامہ

مفاہیم

کراچی

مئی ۲۰۲۲ء

تمام عالمِ اسلام کو عید مبارک

شمارہ ۶

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

جلد ۲

ليتفقهوا في الدين

فقہ اکیڈمی

لیتفقهوا فی الدین

ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر

اقبال

من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین

ماہنامہ مفاہیم کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کی روایت کا علم بردار

سرپرستِ اعلیٰ

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب

مدیر

صوفی جمیل الرحمٰن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب
- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

مضامین

نعت	مرا پیمبر عظیم تر ہے	مظفر وارثی	۴
اداریہ	اعمالِ صالحہ پر دوام	مدیر	۷
درسِ قرآن	نیکی کے کاموں پر مداومت	مولانا محمد اقبال	۱۱
درسِ حدیث	شوال کے چھے روزے	ابنِ عباس	۱۴
مقالات	عشرۂ ذوالحجہ اور عید الاضحیٰ: فضائل و مسائل (۱)	مفتی اویس پاشا قرنی	۱۷
مقالات	بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۱)	صوفی جمیل الرحمان عباسی	۲۸
مقالات	سفرنامۂ ترکی (۴)	مولانا حماد احمد ترک	۳۲
مقالات	امام غزالی علیہ الرحمۃ کی تصوف پر تصنیفات کا جائزہ (۳)	محمد عثمان خان	۳۸
یسئلونک	فوت شدہ روزوں کا فدیہ	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۴۸
ادبیات	نظریاتی ریاست میں ادیب کا کردار (۲)	سلیم احمد	۴۹

مظفر وارثی (۱۹۳۳ـ۲۰۱۱)
معروف نعت گو شاعر

مرا پیمبر عظیم تر ہے

کمالِ خلاق ذات اُس کی
جمالِ ہستی حیات اُس کی
بشر نہیں عظمتِ بشر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

وہ شرحِ احکامِ حق تعالیٰ
وہ خود ہی قانون، خود حوالہ
وہ خود ہی قرآن، خود ہی قاری
وہ آپ مہتاب، آپ ہالہ
وہ عکس بھی اور آئینہ بھی
وہ نقطہ بھی، خط بھی، دائرہ بھی
وہ خود نظارہ ہے، خود نظر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

وہ آدم و نوح سے زیادہ
بلند ہمت، بلند ارادہ
وہ زُہدِ عیسیٰ سے کوسوں آگے
جو سب کی منزل وہ اس کا جادہ
ہر اک پیمبر نہاں ہے اس میں
ہجومِ پیغمبراں ہے اس میں
وہ جس طرف ہے خدا ادھر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

بس ایک مشکیزہ، اک چٹائی
ذرا سی جَو، ایک چارپائی
بدن پہ کپڑے بھی واجبی سے
نہ خوش لباسی نہ خوش قبائی
یہی ہے کُل کائنات جس کی
گنی نہ جائیں صفات جس کی
وہی تو سلطانِ بحر و بر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

جو اپنا دامن لہو سے بھر لے
مصیبتیں اپنی جان پر لے
جو تیغ زن سے لڑے نہتا
جو غالب آ کر بھی صلح کر لے
اسیر دشمن کی چاہ میں بھی
مخالفوں کی نگاہ میں بھی
امیں ہے، صادق ہے، معتبر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم

*****

مدیر

ماہنامہ مفاہیم، کراچی

اعمالِ صالحہ پر دوام

برکت، رحمت اور مغفرت کا مہینا رمضان چلا گیا، روزے ختم ہوئے عید الفطر آگئی یعنی ہمارا اِفطار (روزے نہ رکھنا) شروع ہوا۔ لیکن ہمیں کہنے دیں کہ ”رمضان گیا ہے روزہ نہیں“ یعنی ہم اب بھی روزے سے ہیں ہاں روزے کی قِسم بدل گئی۔ روزے کی جاری قِسم دنیا کا روزہ ہے جس کا افطار، رب کائنات سے ملاقات پر ہی ہو گا۔ بعض اکابر کا قول ہے الدنیا یومٌ ولنا فیهِ صومٌ ولا یَکُوْنُ إِفْطارُہ إِلّا علی مشاهدة الجمال (تفسیر حقی) ”دنیا ایک دن کی طرح ہے اور ہم اس میں روزے سے ہیں اور اس روزے سے افطار نہیں ہو گا مگر محبوبِ حقیقی کے دیدار پر“ یہ وہ صومِ مسلسل ہے جس کا خاتمہ افطارِ وصال پر ہی ہو گا۔ تو چاہیے کہ جس طرح ہم نے صومِ رمضانی میں محنت کی تو اب صومِ زمانی میں بھی محبوب کو راضی کرنے کی محنت میں لگے رہیں۔ مسجدوں سے بے وفائی نہ کریں۔ مصحف کو پیٹھ نہ دکھائیں۔ کاروبارِ زندگی میں بے پروائی نہ برتیں بلکہ اسی تقویٰ و احتیاط کی روش پر گامزن رہیں جس کا اہتمام ہم نے رمضان میں کیے رکھا ہے۔ ” اللہ کے بندے بنو، مزدور مت بنو“ یہ حضرت شیخ الحدیث مولانا اسفندیار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جملہ ہے جو وہ اکثر ارشاد فرمایا کرتے تھے تو ہم اللہ کے مزدور نہیں ہیں کہ ماہِ رمضان میں نیکی کی بھاری مزدوری دیکھ کر کام میں لگ گئے تھے بلکہ ہم تو محبت سے اللہ کو پوجنے والے ہیں ہماری پوجا موسم و ماہ کی پابند تھوڑی ہے کہیں محبت کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالی جاسکی ہیں؟ تو ہم ” رَمَضانی“ نہیں بلکہ ہم ” رَبّانی“ ہیں۔ بِشر الحافی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کچھ لوگ ہیں جو رمضان میں عبادت و ریاضت کرتے ہیں لیکن بعد میں ترک کر دیتے ہیں تو انھوں نے فرمایا: ”یہ تو برے لوگ ہیں جو اللہ کے حقوق محض رمضان ہی میں پہچانتے ہیں، نیک

تو وہ ہے جو سال کے بارہ مہینے اللہ کی عبادت میں محنت کرے"۔ (لطائف المعارف لابن رجب الحنبلی) حضرت شبلی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ عبادات کے اعتبار سے رجب افضل ہے یا شعبان تو انھوں نے جواب دیا: کن ربانیًا، ولا تکن شعبانیًا" تم ربّانی بنو نہ کہ شَعبانی"۔ (لطائف المعارف) نیکیوں کے یہ موسم، یہ شعبان و رمضان تو عبادت و ریاضت کا ذائقہ چکھانے کے لیے ہیں باقی عبادت تو عمر بھر جاری رکھنا ہے: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّى يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ﴾ (الحجر: ۹۹) "اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ تم پر یقینی چیز (موت) آجائے"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب اللہ تعالیٰ کسی شخص سے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے استعمال کر لیتا ہے"۔ پوچھا گیا: یا رسول اللہ! کیسے استعمال کرتا ہے؟ فرمایا: «يُوَفِّقُهُ لِعَمَلٍ صالِحٍ قَبْلَ المَوْتِ ثُمَّ يَقْبِضُهُ عَلَيْهِ» "موت سے پہلے اسے عملِ صالح کی توفیق دیتا ہے اور پھر اسی نیک عملی پر اسے موت بھی دیتا ہے"۔ (الجامع الصغیر) تو ہمیں چاہیے کہ رمضانی عبادات کو مرتے دم تک جاری رکھنے کا عہد و کوشش کریں۔ یقیناً ہم میں سے بہت ساروں نے بہت عبادات کی ہوں گی لیکن فرشتوں کے اعتراف کے مطابق ہم یہی کہہ سکتے ہیں: مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبادَتِكَ (مجمع الزوائد) "اے رب! ہم نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَوْ أَنَّ رَجُلاً يُجَرُّ عَلَى وَجْهِهِ مِنْ يَوْمِ وُلِدَ إِلَى يَوْمِ يَمُوتُ هَرَماً فِي مَرْضَاةِ الله تَعَالَى لَحَقَرَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» (مسند احمد) "اگر کوئی آدمی اپنی پیدائش کے دن سے بڑھاپے کی موت تک اللہ کی رضا پانے کے لیے سجدے میں پڑا رہے تو قیامت والے دن اپنے اس عمل کو حقیر سمجھے گا"۔ تو ہماری رمضانی ریاضتیں، اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر تکیہ کر کے بیٹھ رہیں اور مزید کی جستجو نہ کریں۔ پتا نہیں ہماری عبادات میں کتنی خامیاں رہی ہوں۔ ہمیں اپنی سی عبادت کرنے کے بعد بھی ان سچے اہلِ ایمان کی طرح ڈرتے رہنا چاہیے جن کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا: ﴿وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ "وہ لوگ دیتے ہیں جو دیتے ہیں اور ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں"۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا یہ وہ لوگ ہیں جو چوری، بدکاری اور شراب نوشی کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "اے بنتِ صدیق! نہیں، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو نمازیں پڑھتے، روزے رکھتے اور صدقہ و خیرات کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ڈرتے ہیں کہ

کہیں یہ عمل اللہ کی نگاہ میں ناقابلِ قبول ٹھہریں"۔(سننِ ترمذی)

اپنی عبادت کے مقبول ہونے اور اس کی بنیاد پر خود کو اخروی اجر و ثواب کا حتمی طور پر مستحق سمجھنے سے سستی اور کوتاہی پیدا ہوتی ہے جب کہ اپنے اعمال کے معیار و قبولیت کے بارے میں ڈرتے رہنے سے مزید محنت و مسابقت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔آیتِ مبارکہ ﴿وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ "وہ لوگ دیتے ہیں جو دیتے ہیں اور ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں" کے بعد والی آیت پڑھیے تو بالکل مسابقت الی الخیرات کی طرف راہنمائی کرتی معلوم ہوتی ہے: ﴿أُولَئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ﴾(المؤمنون:٦١)" یہی لوگ ہیں جو نیکیاں کرنے میں جلدی کرتے ہیں اور نیکیوں کے لیے سبقت لے جانے والے ہوتے ہیں"۔تو جو لوگ اپنی عبادت پر گھمنڈ نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ اس کے کم ہونے اور اس کے ناقابلِ قبول ہونے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں وہ نیکیوں کے سلسلے کو منقطع نہیں کرتے۔حدیث پاک میں آتا ہے:«لَا يَشْبَعُ الْمُؤْمِنُ خَيْرًا حَتَّى يَكُونَ مُنْتَهَاهُ الْجَنَّةُ»(صحیح ابنِ حبان)" نیکیوں سے مومن کا جی کبھی نہیں بھرتا یہاں تک کہ جنت اس کی منزل بن جاتی ہے"۔علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے سعید ابن جبیر رحمہ اللہ کا قول مجموع الفتاوی میں نقل کیا ہے:ثَوَابُ الْحَسَنَةِ الْحَسَنَةُ بَعْدَهَا" نیکی کا ثواب اس کے بعد کی نیکی ہے"۔

مداومتِ عمل

اعمال میں مداومت ایک پسندیدہ صفت ہے۔بقول ملا علی القاری اعمال میں تاثیر اسی سے پیدا ہوتی ہے۔سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے اعمال کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:كَانَ عَمَلُهُ دِيمَةً "آپ ﷺ کا عمل دائمی تھا"۔ایک بار نبی کریم ﷺ کو سائلین نے نمازِ ظہر کے بعد کی سنتوں سے مشغول کر دیا تو نمازِ عصر کے بعد حجرۂ عائشہ میں یہ دو رکعت ادا فرمائیں۔اس کے بعد آپ ﷺ نے معمول بنا لیا کہ جب عصر پڑھ کر گھر میں داخل ہوتے تو دو رکعت نماز ادا کرتے اور فرماتے:«كَرِهْتُ أَنْ أَدَعَهُمَا» " مجھے اچھا نہیں لگتا کہ ان رکعتوں کو ترک کر دوں"۔

(مسندِ احمد) نبی کریم ﷺ کے اس عمل اور آپ کی تربیت کا اثر تھا کہ آپ ﷺ کے گھر والوں کا عام مزاج یہ بن گیا تھا کہ جو عمل کرتے اس پر مداومت کی کوشش کرتے: «وَكَانَ آلُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا عَمِلُوا عَمَلًا أَثْبَتُوهُ» (صحیح مسلم) " آلِ محمد ﷺ جب کوئی عمل کرتے تو اس پر اثبات کرتے "اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم رمضان کی طرح تیس روزے ہر ماہ رکھنا شروع کر دیں۔ بیس تراویح کو نمازِ عشا کا مستقل حصہ بنا ڈالیں؟ تو ظاہر ہے کہ مداومت سے مراد روزے یا صلاۃ اللیل کی اصل کو باقی رکھنا ہے نہ کہ اس کی مقدار کو، شریعت کی دوسری تعلیمات کے علاوہ حدیث درج ذیل میں اس طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: " اللہ کے ہاں محبوب عمل کون سا ہے؟" فرمایا: «أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ» "عمل چاہے تھوڑا ہی سہی لیکن دائمی ہونا چاہیے "۔ (صحیح بخاری) تو اس حدیث کی روشنی میں رمضان کی مقدارِ عبادت میں کمی کرتے ہوئے، اقسامِ عبادت کو غیر رمضان میں جاری رکھنا ہی عبادات پر مداومت کہلائے گا۔

آخری بات یہ ہے کہ خیر کے کام بہت سے ہیں۔ ان کا احاطہ ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے۔ نمازِ با جماعت، دعا و مناجات، ذکر و اذکار اور صدقہ و خیرات سمیت جتنی بھی نیکیاں کرنے کی اللہ نے ہمیں رمضان میں توفیق دیے رکھی، ان میں سے کسی کو بالکلیہ ترک کرنے سے بچنا چاہیے۔ اور چاہے تھوڑا ہی سہی لیکن ان کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس سے امید ہے ہم تقربِ الٰہی میں ترقی حاصل کریں گے۔

*****

مولانا محمد اقبال
رکن شعبہ تحقیق و تصنیف

نیکی کے کاموں پر مداومت

سورۃ حم السجدۃ، آیت: ۳۰

﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ﴾

”جن لوگوں نے کہا ہے کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر بیشک فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اتریں گے کہ: نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو، اور اس جنت سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا“۔

تفسیر

آیتِ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے ان خوش قسمت افراد کا تذکرہ فرمایا ہے جنھوں نے ایک دفعہ دین حق کو قبول کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس ایمان وایقان پر مرتے دم تک قائم ودائم رہے، تو موت کے وقت ان پر فرشتے اترتے ہوئے یہ خوش خبری سنائیں گے کہ تم ہرگز خوف نہ کرو اور جنت جیسی عظیم الشان نعمت جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا اس پر خوش وخرم رہو۔ اس آیتِ مبارکہ میں نجاتِ اُخروی کے لیے ایمان واسلام پر استقامت اور مداومت شرط قرار دی گئی ہے۔ حضرت سعید بن عمران رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب مذکورہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے تلاوت کی گئی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: هُمُ الَّذِينَ لَمْ يُشْرِكُوْا بِاللهِ شَيْئًا (تفسیر الطبری، ج:۲۱، ص:۴۶۴) ”یہ وہ لوگ ہیں

جنھوں نے ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بنایا"۔ اسی طرح امام مجاہد رحمہ اللہ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾ قال: أَسْلَمُوْا ثُمَّ لَمْ يُشْرِكُوْا بِهٖ حَتَّى لَحِقُوا بِه (تفسیر الطبری، ج:۲۱، ص:۴۶۵) "جن لوگوں نے کہا ہے کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یہ درحقیقت وہ لوگ ہیں جو مسلمان ہوئے پھر شرک سے آلودہ نہیں ہوئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے"۔

اس آیتِ مبارکہ کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور پھر اس کے تقاضوں کی تکمیل کی یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر قائم و دائم رہے تو ان پر موت کے وقت فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اتریں گے کہ: نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو، اور اس جنت سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾ قال: عَلَى عِبادَةِ اللهِ وعلى طاعَتِه، (تفسیر الطبری، ج:۲۱، ص:۴۶۶) "جن لوگوں نے کہا ہے کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور فرمانبرداری پر قائم رہے"۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے صرف زبانی اقرار نہیں کیا بلکہ عمل کے ذریعے اس کا ثبوت بھی فراہم کیا اور عبادت و فرمان برداری پر مداومت اختیار کی۔ اس آیتِ مبارکہ میں جہاں اہلِ ایمان کو جنت کی خوشخبری دی گئی ہے وہاں یہ بات بھی بتلائی گئی ہے کہ اس کا دار و مدار عبادات و طاعات کی ہمیشگی اور مداومت پر ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اہلِ ایمان کے لیے پسندیدہ یہ ہے کہ وہ خیر کے جن کاموں سے وابستہ رہتے ہیں انھیں مستقل مزاجی اور مداومت کے ساتھ جاری رکھنے چاہییں۔ کیونکہ اعمالِ صالحہ میں مستقل مزاجی اور مداومت ایک ایسا وصف ہے جس کی بدولت بظاہر ایک چھوٹے عمل سے وہ نتائج حاصل ہوتے ہیں جو ایک بڑے عمل سے جسے جاری نہ رکھا جائے حاصل نہیں ہوتے۔ شریعت کی نظر میں وہ قلیل عمل جس پر مداومت اور مستقل مزاجی کے ساتھ عمل ہوتا ہو ان اعمال کثیرہ سے کہیں بہتر ہے جنھیں مستقل بنیادوں پر جاری نہ رکھا جا سکے۔ جناب رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی سیرت میں ہمیں یہ اصول ملتا ہے کہ حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم تمام کاموں میں مداومت پر کاربن رہے ہیں۔ آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے جس کام جس موقعے پر کیا پھر اس پر برابر قائم رہے یہاں تک کہ اسے سنت کا درجہ مل گیا، کیونکہ سنت کے معنیٰ یہی ہیں کہ ہر وہ کام جسے حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے شروع فرمایا اور پھر اس پر مواظبت (مداومت) فرمائی۔ ام المومنین

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرماتی ہیں: «سَدِّدُوا وَقَارِبُوا، وَاعْلَمُوا أَنْ لَنْ يُدْخِلَ أَحَدَكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ، وَأَنَّ أَحَبَّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللهِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ »(بخاری شریف) ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اعمال میں میانہ روی اختیار کرو اور عمل کرتے رہو، تم میں سے محض کسی کا عمل اسے جنت میں نہیں داخل کر سکے گا اور بیشک میرے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر ہیشگی کی جائے خواہ کم ہی کیوں نہ ہو“۔

رسول اللہ ﷺ کے اس قولِ مبارک میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ اعمال کی کثرت مطلوب نہیں ہے بلکہ عمل پر مداومت مطلوب ہے کہ انسان جس کارِ خیر کا آغاز کرے تو مستقل مزاجی سے اسے بجالاتا رہے، کبھی اسے چھوڑے نہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جب کسی کو نصیحت فرماتے تھے تو یہ ارشاد فرماتے تھے: عليكَ بِتقْوَى اللهِ والاِسْتِقَامَة (زہرۃ التفاسیر، دار الفكر العربي، ج:۷، ص:۳۷۶۲) ”اپنے اوپر تقویٰ اور نیک اعمال پر مداومت لازم کرلیں“۔

چونکہ رمضان المبارک کا بابرکت مہینا ابھی ابھی گزرا ہے اور اس کے اثرات اب بھی باقی ہیں، لہذا ہونا تو یہ چاہیے کہ اس مہینے میں شروع کیے گئے نیک اعمال کو مستقل بنیادوں پر جاری رکھا جائے۔ اگر وہ تمام معمولات جاری رکھنا مشکل ہیں تو کم از کم تھوڑے ہی سہی کسی نہ کسی درجے میں انھیں جاری رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ وقتی جوش و جذبے کی بنیاد پر جو عمل بجالایا جائے وہ مستقل طور پر جاری نہیں رکھا جاتا اور اس کا فائدہ بھی اتنا نہیں ہوتا، البتہ اگر اس پر تھوڑی بہت محنت کی جائے تو اسے اپنے معمولات کا حصہ بنانا مشکل نہیں ہے۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ اللہ رب العزت کی توفیق سے رمضان المبارک میں جن نیک اعمال کا آغاز کیا تھا انھیں اپنی زندگی کے دیگر شب و روز کے معمولات کا حصہ بنائیں اور کسی نہ کسی درجے میں ان سے وابستگی برقرار رکھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ رمضان المبارک میں ہماری طرف سے کیے گئے چند ٹوٹے پھوٹے اعمال کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں اور اس کے بعد بھی ہمیں نیک اعمال کی توفیق بخشیں۔ آمین

****

ابنِ عباس
معاون قلم کار

شوال کے چھے روزے

عَنْ أَبي أَيوبِ رضِيَ الله عَنْهُ أَنَّ رسولَ اللهِﷺقَالَ: «مَنْ صَامَ رَمَضانَ ثُمَّ أَتبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كانَ كصِيَامِ الدَّهْرِ»(صحيح مسلم) ”سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد شوّال کے چھے روزے بھی رکھے تو وہ گویا ہمیشہ کا روزے دار ہے“۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ وَأَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ خَرَجَ مِنْ ذُنُوبِهِ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ»(المعجم الأوسط) ”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد شعبان کے چھے روزے رکھے تو وہ گناہوں سے اس دن کی طرح صاف ہو جائے گا جب اسے اس کی ماں نے جنا تھا“۔

عَنْ ثَوْبَانَ أَنَّ رَسُولَ اللهِﷺقَالَ: «جعلَ اللهُ الحسنةَ بعشرِ أمثالها»صِيَامُ رَمَضَانَ بِعَشَرَةِ أَشْهُرٍ، وَصِيَامُ السِّتَّةِ أَيَّامٍ بِشَهْرَيْنِ، فَذَلِكَ صِيَامُ السَّنَةِ يَعْنِي رَمَضَانَ وَسِتَّةَ أَيَّامٍ بَعْدَهُ(صحيح الترغيب) ”حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ، نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نیکی کا اجر دس گنا بڑھایا ہے۔ ماہِ رمضان کے روزے اجر میں دس مہینے کے روزوں کے برابر ہیں۔ جب کہ (عید الفطر کے بعد شوال کے) چھے روزے اجر میں دو مہینے کے برابر ہیں اس طرح رمضان اور اس کے بعد کے چھے روزوں کا اجر سال بھر کے روزوں کے برابر ملے گا“۔

رمضان کے بعد ماہِ شوال میں چھے روزے رکھنا ایک مستحب عمل ہے۔ بعض لوگ امام مالک کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ آپ ان روزوں کو مکروہ قرار دیتے تھے، علامہ ابن عبد البر المالکی رحمہ اللہ نے الاستذکار میں حضرت امام کے قول کی یہ توجیہ کی ہے کہ اگر روزے رکھنے والا ان روزوں کو رمضان کے روزوں کا لازمی حصہ تصور کر کے یہ روزے رکھے یا عید کے دن کا بھی روزہ رکھ کر شوال کے چھے روزوں کو رمضان سے ملا دے تو یہ طرزِ عمل موجبِ کراہت ہے۔ ماہِ رمضان اور شوال کے چھے روزوں کا بڑھتا چڑھتا اجر، اس قرآنی اصول کے مطابق ہے کہ ﴿مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ (الانعام:۱۶۰) ”جو کوئی نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس جیسی دس نیکیوں کا اجر ہے“۔ بعض روایتوں میں ان روزوں کا اجر ہمیشہ کے روزے کے برابر بتایا گیا جب کہ بعض روایتوں میں سال بھر کے روزوں کے برابر، مندرجہ بالا آیت کی رو سے یہ ایک سال کا اجر ہی بنتا ہے لیکن اسے صیام الدہر کے برابر قرار دینے کی وجہ تو یہ ہے کہ جب مسلمان ہر سال رمضان کے بعد یہ عمل کرتا رہے گا تو اسے عمر بھر کا اجر حاصل ہو کر رہے گا اور اس ہر رمضان کے بعد شوال کے چھے روزے رکھنے کی اشارت پائی جاتی ہے۔ (واللہ اعلم) ملا علی القاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روزے عید کے اگلے دن سے، ایک تسلسل کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں لیکن چند روز کے وقفے سے رکھنا بہتر ہے تاکہ شوال کے روزوں کا رمضان کا حصہ قرار پانے کا احتمال بھی نہ رہے۔

امام ابن رجب الحنبلی رحمہ اللہ نے شوّال کے روزوں کے درج ذیل فوائد نقل کیے ہیں:

۱: ان روزوں کے اہتمام سے سال بھر یا عمر بھر کے روزوں کا ثواب ملتا ہے۔

۲: جس طرح فرض نماز کے پہلے یا بعد کچھ سنت و نفل رکعت مشروع کی گئی ہیں جو فرض کی تکمیل کرتی ہیں تو شوال کے چھے روزے رمضان کے روزوں کے لیے سنن و نوافل کی مانند ہیں جو اس کی تکمیل کرتے ہیں اور گناہوں کی معافی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

۳: رمضان کے بعد شوال کے روزے، رمضان کے روزوں کی قبولیت کی نشانی ہیں اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کا عمل قبول کرتا ہے تو اسے مزید عمل صالح کی توفیق دیتا ہے۔

۴: شوال کے روزوں میں شکرگزاری پائی جاتی ہے۔ رمضان کے روزے اور قیام کی برکت سے مسلمان کے پچھلے گناہ

معاف کر دیے جاتے ہیں۔ پھر عید الفطر کے دن بھی مسلمانوں کے لیے عام معافی و مغفرت کا اعلان کیا جاتا ہے تو اس احسانِ عظیم کے شکرانے کے طور پر شوال کے روزے رکھنے چاہییں۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب کہا گیا کہ آپ قیام اللیل میں اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں جب کہ اللہ نے تو آپ کی اگلی پچھلی مغفرت کر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں“۔ تو ہمیں رمضان کے شکرانے میں مزید روزے رکھنے چاہییں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے احکامِ رمضان کے ذیل میں ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) کا فرمان بھی جاری کیا ہے۔ بعض اسلاف نیک عمل پر شکر کا خاص اہتمام کرتے اگر انھیں قیام کی توفیق ہوتی تو اگلے دن شکرانے میں روزہ رکھ لیتے۔

۵: یہ روزے تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہیں۔ اس لیے کہ رمضان ختم ہونے سے قربِ الٰہی کی تلاش ختم نہیں ہوتی چنانچہ حدیث میں آتا ہے «اَلصَّائِمُ بَعْدَ رَمَضَانَ كَالْكَارِّ بَعْدَ الْفَارِّ» (الجامع الصغیر) ”رمضان کے بعد روزے رکھنے والا ایسے ہے جیسے میدانِ جنگ سے فرار ہونے والا واپس پلٹ آئے“۔

٦: حدیث میں قرآن ختم کر کے دوبارہ شروع کرنے والے قاری کی فضیلت بیان ہوئی ہے پس رمضان کے روزوں سے فراغت کے بعد شوال کے روزے شروع کرنے والا صائم قرآن کے دور کی ابتدا کرنے والے قاری سے مشابہ ہے۔

*****

مفتی اویس پاشا قرنی

مدیر فقہ اکیڈمی

عشرۂ ذوالحجہ اور عید الاضحیٰ: فضائل و مسائل (۱)

عشرہ عربی میں دس کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے ذوالحجہ کے ابتدائی دس دن مراد ہیں۔ ان ایام کے بہت سے فضائل احادیث میں وارد ہوئے ہیں۔ جو اعمال ان میں نبی ﷺ نے تلقین فرمائے ہیں ان میں سے بعض واجب کا درجہ رکھتے ہیں، بعض سنتِ مؤکدہ کا اور بقیہ احکام مستحب واقع ہوئے ہیں۔ اولاً ان ایام کی فضیلت کو سمجھ لینا مفید ہو گا۔

عشرۂ ذوالحجہ کے چند فضائل

سورۃ الفجر کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے بعض قسمیں اٹھائیں ہیں۔ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب قرآن مجید میں کسی شے کی قسم اٹھاتے ہیں تو اس کا ایک مقصد ''مقسوم بہ'' کی فضیلت ظاہر کرنا بھی ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالْفَجْرِ*وَلَيَالٍ عَشْرٍ *وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ ''قسم ہے فجر کی، اور دس راتوں کی، اور جفت اور طاق کی''۔ (سورۃ الفجر: ۱تا۳) پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فجر کے وقت کی قسم اٹھائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وقت اپنے دامن میں بہت سی فضیلتیں سمیٹے ہوئے ہے۔ بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت میں خاص یومِ عرفہ کی فجر مراد ہے۔ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کی قسم اٹھائی۔ ان دس راتوں کو متعیّن کرنے میں مفسرین نے الگ الگ آرا کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اکثریت کا رجحان ذوالحجّہ ہی کی ابتدائی دس راتوں کی جانب ہے۔ معلوم ہوا کہ ان راتوں کی خاص فضیلت ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بہت سے علمائے کرام نے یہ بحث فرمائی کہ پورے سال میں سب سے زیادہ فضیلت کے

حامل ایام کون سے ہیں۔اسی بحث کے نتیجے میں بعض حضرات نے تو ذوالحجہّ کے ابتدائی دس ایام کو رمضان کے آخری عشرے سے بھی زیادہ فضیلت کا حامل قرار دیا ہے۔اگرچہ اکثریت کی رائے اس سے مختلف ہے مگروہ حضرات بھی رمضان کے آخری عشرے کو صرف لیلۃ القدر کے باعث افضل جانتے ہیں۔تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے جفت اور طاق کی قسم اٹھائی ہے۔اگرچہ ان کے تعیّن میں بھی بہت سے اقوال ہیں لیکن یہاں مضمون کی مناسبت سے ایک قول پیش کیا جاتا ہے،وہ یہ کہ جفت سے یوم النّحر اور طاق سے یومِ عرفہ مراد ہے۔(دیکھیے زادالمسیر از امام ابن جوزی رحمہ اللہ)

اسی طرح نبی ﷺ کی ایک حدیثِ مبارکہ ملاحظہ ہو:«مَا الْعَمَلُ فِي أَيَّامٍ أَفْضَلَ مِنْهَا فِي هَذِهِ، قَالُوا:وَلا الجِهَادُ، قَالَ: وَلَاالجِهادُ، إِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ يُخَاطِرُ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ، فَلَمْ يَرْجِعْ بِشَيْءٍ»(بخاری شریف)”کوئی دن ایسانہیں ہوتا جس میں اللہ کے نزدیک اچھے اعمال ذوالحجہّ کے پہلے دس دن میں کیے ہوئے اعمال سے زیادہ محبوب ہوں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا:یارسول اللہ !کیا اللہ کی راہ میں جہاد بھی نہیں ؟آپ ﷺ نے فرمایا:اللہ کی راہ میں جہاد بھی نہیں سوائے اس شخص کے جو جان ومال لے کر جہاد کے لیے نکلے اور پھر ان میں سے کوئی چیز بھی واپس نہ لائے“۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک ان ایام کی غیر معمولی اہمیت ہے۔

عشرۂ ذوالحجہ کے چند اعمال

ذوالحجہ کے پہلے عشرے میں کئی اعمال مشروع ٹھہرائے گئے ہیں۔ان میں سے بعض تو مستحب و مسنون ہیں اور بعض واجب کے درجے کے ہیں۔اب ہم ان اعمال کو ان کی فضیلت اور ان کی فقہی و شرعی حیثت وحکم کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ دین کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ کسی کی مشابہت بھی اس کے اجر یاوزر(وبال)میں شریک کر دیتی ہے۔نیک لوگوں کی مشابہت نیکوں کے زمرے میں جبکہ فسّاق وفجّار کی مشابہت اُن ہی کے زمرے میں شریک کردیا کرتی ہے۔اس بات کو آپ ﷺ نے یوں تعبیر فرمایا:«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» (سنن ابی داوٗد)”جو جس قوم کی مشابہت کرتا ہے وہ اُن ہی میں شمار کیا جائے گا“۔ایک اور روایت میں فرمایا:«مَنْ كَثَّرَ سُوَادَ قَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» (مسندِ

ابی یعلیٰ)"جو کسی قوم کے پرستاروں کی تعداد میں اضافے کا ذریعہ بنے تو وہ اُن ہی میں شمار کیا جائے گا"۔ایک معنی یہ بیان کیا گیا کہ دنیا میں ان میں شمار کیا جائے گا جبکہ بعض نے اسے آخرت سے متعلّق مانا ہے۔اور ایک معنی تو بالکل واضح ہے کہ وہ ان کے اجر یا وزر (وبال) میں شریک ٹھہرا دیا جائے گا۔چونکہ ان ایام میں بہت سے حضرات احرام کی پابندیوں میں حج کی عظیم عبادت ادا کر رہے ہوتے ہیں اور اِن ہی میں ایک پابندی بال اور ناخن نہ کاٹنے کی بھی ہے،اس لیے تمام اطراف و اکنافِ عالم میں بسنے والے مسلمانوں کو بھی اس کی ترغیب دے کر حجاج کی فضیلت میں شریک کر لیا گیا۔ارشادِ نبوی ہے:«إِذَا رَأَيْتُمْ هِلَالَ ذِي الْحِجَّةِ وَأَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يُضَحِّيَ فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهِ وَأَظْفَارِهِ»(مسلم شریف)"جب ذوالحجّہ کا مہینا شروع ہو اور تم میں سے کسی کا قربانی کا ارادہ ہو تو اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے"۔اس روایت میں تو صرف قربانی کا ارادہ رکھنے والے کا ذکر آیا ہے جبکہ دیگر روایات میں اس عمل کو بقیہ مسلمانوں کے لیے بھی مشروع قرار دیا گیا ہے۔ایک روایت ملاحظہ ہو:«أُمِرْتُ بِيَوْمِ الْأَضْحَى عِيدًا جَعَلَهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ لِهَذِهِ الْأُمَّةِ، قَالَ الرَّجُلُ: أَرَأَيْتَ إِنْ لَمْ أَجِدْ إِلَّا أُضْحِيَةً أُنْثَى أَفَأُضَحِّي بِهَا؟قَالَ :لَا وَلَكِنْ تَأْخُذُ مِنْ شَعْرِكَ وَأَظْفَارِكَ وَتَقُصُّ شَارِبَكَ وَتَحْلِقُ عَانَتَكَ فَتِلْكَ تَمَامُ أُضْحِيَّتِكَ عِنْدَ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ»(سننِ ابی داوٗد)"مجھے حکم دیا گیا ہے یوم الاضحیٰ کو عید منانے کا،(کہ)اللہ نے اس دن کو اس امت کے لیے (عید) بنا دیا ہے۔ایک صاحب نے دریافت کیا:اے اللہ کے رسول!اگر میرے پاس صرف ایک بکری یا اونٹنی ہو جسے میں نے کسی کام سے اجارے وغیرہ پر لیا ہو تو کیا میں اسے ذبح کر دوں۔آپ ﷺ نے فرمایا:نہیں،بلکہ (جب بقیہ افراد ذبیحہ پیش کریں) تو تم اپنے بال اور ناخن کاٹ لینا اور مونچھیں کتروا لینا اور زیرِ ناف بال صاف کر لینا،پس اللہ کے نزدیک اسی پر تمھارے لیے قربانی کا پورا پورا اجر ہوگا"۔

ہمارے علماے احناف کے نزدیک ان ایام میں بالوں اور ناخنوں کا نہ کاٹنا قسمِ مستحب میں شامل ہے یعنی پابندی پر ثواب ہے،اگر پابندی نہ بھی کرے تو گناہ نہیں ہوگا۔جبکہ حنابلہ کے نزدیک ان کا کاٹنا حرام ہے۔[1]

دن کا روزہ اور شب کی عبادت

فضیلتِ عشرۂ ذوالحجہ سے متعلق مذکورہ روایت سے یہ بات تو واضح ہے کہ ان ایام میں کیا جانے والا ہر نیک عمل بقیہ ایام کی نسبت زیادہ فضیلت کا حامل ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ایام کو قیمتی کس طرح بنایا جائے۔ کیوں کہ دین کی اساس نبی ﷺ اور خیر القرون پر قائم ہے تو اس معاملے میں بھی ان ہی سے رجوع کرنا مفید معلوم ہوتا ہے۔ نبی ﷺ نے ان ایام میں مسلسل روزے رکھنے کی عبادت کو مشروع ٹھہرایا ہے اور ان راتوں کے لیے قیام اللیل کی خصوصی ترغیب بھی دی ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: «مَا مِنْ أَيَّامِ الدُّنْيَا أَيَّامٌ أَحَبُّ إِلَى اللهِ سُبْحَانَهُ أَنْ يُتَعَبَّدَ لَهُ فِيهَا، مِنْ أَيَّامِ الْعَشْرِ، وَإِنَّ صِيَامَ يَوْمٍ فِيهَا لَيَعْدِلُ صِيَامَ سَنَةٍ، وَلَيْلَةٍ فِيهَا بِلَيْلَةِ الْقَدْرِ» (سننِ ابنِ ماجہ) ”اللہ کے نزدیک کسی بھی دن کی عبادت عشرۂ ذوالحجہ کی عبادت سے زیادہ محبوب نہیں ہے، اس کے ہر دن کا روزہ سال بھر کے روزوں کے برابر اور اس کی رات کا قیام لیلۃ القدر کے قیام کے برابر ہے“۔

یومِ عرفہ کا روزہ

جہاں اس عشرے میں روزوں کی عمومی ترغیب دی گئی ہے وہیں یومِ عرفہ یعنی نو ذوالحجہ کے روزے کو خصوصی اہمیت کا حامل ٹھہرایا گیا ہے۔ عرفہ اس میدان کا نام ہے جہاں حجاجِ کرام نو ذوالحجہ کو قیام فرماتے ہیں۔ حدیث میں آیا: «الحَجُّ يَوْمُ عَرَفَةَ» (سننِ ابی داؤد) ”حج قیامِ عرفہ کا نام ہے“۔ حجاج کے لیے اس دن کی اہمیت وقوف کے اعتبار سے ہے، اس لیے حجاج اس دن کا روزہ نہیں رکھیں گے۔ جبکہ بقیہ اطراف و اکنافِ عالم میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے اس دن کا روزہ مشروع ٹھہرایا گیا ہے۔ سنن ابی داود کی روایت ہے: «كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَصُومُ تِسْعَ ذِي الْحِجَّةِ، وَيَوْمَ عَاشُورَاءَ» (سننِ ابی داؤد) ”رسول اللہ ﷺ نو ذوالحجہ اور یومِ عاشورا کا روزہ رکھا کرتے تھے“۔ اس روایت میں نبی ﷺ نے روزے کی فضیلت کو نو تاریخ کے ساتھ متعلق کیا ہے، اسی لیے علما نے فرمایا کہ تمام اطرافِ عالم میں بسنے والے مسلمان اپنی رؤیتِ قمری کے اعتبار سے اس روزے کا تعین کریں گے۔ عوام میں یہ بات غلط مشہور ہے کہ نو ذوالحجہ کا روزہ سعودی عرب کی

رؤیت کے مطابق رکھا جائے گا۔ حالانکہ جس طرح رمضان و عید کے تعین میں اپنی ہی رؤیت کا اعتبار ہوتا ہے اسی طرح ۹ ذوالحجہ کی فضیلت بھی اپنی ہی رؤیت سے متعلق ہے۔ اس بات کو یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ روزہ اصلاً غیر حجاج کے لیے مشروع ہے، حجاج کے لیے اس دن روزہ رکھنا ممنوع ہے، تو یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی ہے کہ اس کے تعین میں حجاج کی رؤیت کا اعتبار ہو۔ پس معلوم ہوا کہ یہ روزہ بھی تمام مسلمان اپنی اپنی رؤیت کے اعتبار سے ہی رکھیں گے۔ اس روزے کی فضیلت کو نبی ﷺ نے بایں الفاظ بیان فرمایا: «صِيَامُ يَوْمِ عَرَفَةَ، أَحْتَسِبُ عَلَى اللهِ أَنْ يُكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِي قَبْلَهُ وَ السَّنَةَ الَّتِيْ بَعْدَهُ» (مسلم شریف) "یومِ عرفہ کے روزے کے بارے میں؛ میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ یہ ایک سال قبل اور ایک سال بعد کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا"۔ معلوم ہوا کہ عمل تو بہت ہی مختصر ہے مگر اس پر جو اجر دیا جا رہا ہے وہ نہایت قیمتی و بیش بہا ہے۔ یہ اجر و ثواب ویسے تو ہر شخص کے لیے ہے لیکن ایک بات کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے۔ اور وہ یہ کہ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، لہٰذا ایسے گناہوں سے توبہ کے ساتھ اگر یہ اعمال انجام دیے جائیں تو نہایت مفید ثابت ہوں گے۔ لہٰذا اس فضیلت کو سمیٹنے کا خود بھی اہتمام کرنا چاہیے اور گھر والوں کو بھی اس کی ترغیب دلانی چاہیے۔

اس عشرے کا خاص عمل

ہمارے دین کا یہ مستقل قاعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس شے کو چاہیں فضیلت بخش دیں، قرآن میں فرمایا: ﴿وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخْتَارُ﴾ "اور تمھارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (جو چاہتا ہے) پسند کرتا ہے"۔ (القصص: ٦٨) معلوم ہوا کہ عقل پرست شخص دین دار نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کو دین کا ہر حکم ماننے کے لیے logical reasoning سے گزرنا پڑتا ہو وہ دین کے مزاج سے آشنا ہی نہیں ہوا۔ یہ دین اللہ کا ہے اور یہ اسی کے مختارِ کل ہونے کا مظہر ہے کہ وہ جس شے کو چاہے افضل قرار دے دے، اگرچہ عقل اس فضیلت کو نہ سمجھتی ہو۔ مثلاً سال میں بارہ مہینے ہیں، حجم کے اعتبار سے سب ہی برابر ہیں لیکن اللہ نے رمضان کے مہینے کو بقیہ کی نسبت ایک خاص مقام دے دیا۔ اسی طرح جمعے کا دن بقیہ ایام سے افضل قرار پایا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ آج کا جدید ذہن چاہتا ہے کہ پہلے ہر بات کو سمجھ لے اور پھر مانے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ

نے بہت سے ایسے احکام جاری کیے ہیں جن کی حکمت صرف وہ ہی جانتا ہے اور ان کی مقصدیت کو سمجھے بغیر ہی انھیں انجام دے دینا مقصود ہے جیسا کہ مضمون کے آغاز میں مفصلاً ذکر ہوا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بعض ایام میں بعض اعمال کا اجر بڑھادیا ہے۔ ویسے تو ان ایام میں تمام ہی اعمال قیمتی ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ کے تحت کوئی ایک خاص عمل بقیہ اعمال سے بھی افضل قرار پاتا ہے۔ مثلاً رمضان کا ہر عمل ہی مبارک ہے مگر تلاوتِ قرآن اس مہینے کا خاص عمل شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ذوالحجہ کے پہلے عشرے میں یہ اعلیٰ فضیلت ذکر و اذکار کے ساتھ خاص کی گئی ہے۔ پھر تمام اذکار میں سے بھی تسبیح، تحمید، تہلیل اور تکبیر کو افضلیت بخشی گئی ہے۔ (یہ تمام کلمات تیسرے کلمے میں جمع کر دیے گئے ہیں)۔ ارشادِ نبوی ہے: «مَا مِنْ أَيَّامٍ أَعْظَمُ عِنْدَ اللهِ وَلَا أَحَبُّ إِلَيْهِ مِنَ الْعَمَلِ فِيهِنَّ مِنْ هَذِهِ الْأَيَّامِ الْعَشْرِ، فَأَكْثِرُوا فِيهِنَّ مِنَ التَّهْلِيلِ وَالتَّكْبِيرِ وَالتَّحْمِيدِ» (مُسندِ احمد) "کوئی دن اللہ کے نزدیک عشرۂ ذوالحجہ سے زیادہ عظمت والا نہیں ہے اور کسی دن میں کیا ہوا عمل بھی اللہ کے نزدیک ان ایام میں کیے ہوئے عمل سے زیادہ محبوب نہیں، ہے تو پس تم ان ایام میں تہلیل، تکبیر اور تحمید کی کثرت کیا کرو"۔ تہلیل سے لا الہ الا اللہ، تحمید سے الحمدللہ اور تکبیر سے اللہ اکبر کہنا مراد ہے۔ بعض روایات میں تسبیح (سبحان اللہ کہنا) کا بھی ذکر آیا ہے۔ حضرت ابنِ عمر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما کا تو معمول تھا کہ آپ دونوں ان ایام میں بازاروں میں جا کر بلند آواز سے تکبیر پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ بقیہ افراد بھی ساتھ آوازیں ملا لیا کرتے تھے۔ ہماری زندگی میں کچھ اوقات ایسے ہوا کرتے ہیں جن میں لازمی طور پر کچھ نہ کچھ وقت ضائع ہو رہا ہوتا ہے۔ جسے آج compulsory waste of time سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خصوصاً ان ایام میں اور عموماً پورے سال میں تمام اوقات کو اللہ کے ذکر سے حقیقتاً قیمتی بنا لینا چاہیے۔ ان اذکار کے علاوہ استغفار کو بھی ایک خاص فضیلت سے نوازا گیا ہے۔ ہر فرد کو چاہیے کہ روزانہ کثرت سے اس کا بھی ورد کیا کرے۔

تکبیرِ تشریق

عشرۂ ذوالحجہ کے واجب اعمال میں سے ایک عمل تکبیراتِ تشریق کا ہے۔ جہاں ذکر و اذکار کی عمومی ترغیب دی گئی ہے

وہیں یہ خاص ذکر ایسا ہے جسے واجب ٹھہرا دیا گیا ہے۔ احادیث میں دو مختلف طریقوں سے اس کا ذکر وارد ہوا ہے۔ پہلا طریقہ ملاحظہ ہو: اللّٰہُ أَکْبَرُ اللّٰہُ أَکْبَرُ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ أَکْبَرُ اللّٰہُ أَکْبَرُ و لِلّٰہِ الْحَمْدُ (مصنَّف ابنِ ابی شیبہ) دوسرا صیغہ بایں الفاظ نقل ہوا: اللّٰہُ أَکْبَرُ کَبِیْرًا وَّ سُبْحَانَ اللہِ وَ بِحَمْدِہٖ بُکْرَۃً وَّ أَصِیْلًا (کتاب الاُم، للشافعی) اس تکبیر کو دونوں ہی طریقوں سے پڑھنا جائز ہے۔ اگرچہ ہمارے علمائے احناف کے نزدیک پہلا اور شوافع کے نزدیک دوسرا طریق اولیٰ ہے۔

طریقہ: ۹ ذوالحجہ کی فجر سے لے کر ۱۳ ذوالحجہ کی عصر تک ہر فرض نماز کے بعد ایک مرتبہ بلند آواز سے اس تکبیر کا پڑھنا واجب ہے۔ مفتیٰ بہ قول کے مطابق یہ تکبیر؛ امام، مقتدی، منفرد، مسبوق، مرد و عورت سب ہی پر واجب ہے۔ [۲] مسافر پر اصلًا تو یہ تکبیر واجب نہیں ہے لیکن اگر وہ کسی مقیم امام کی اقتدا میں نماز ادا کرے تو تبعًا اس پر بھی اس کا وجوب ثابت ہو جاتا ہے۔ مردوں کے لیے باآوازِ بلند اور مستورات کے لیے آہستہ آواز میں اس تکبیر کا پڑھنا واجب ہے۔ مرد چونکہ عمومًا مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتے ہیں اس لیے ان کے لیے اس تکبیر کا یاد رکھنا آسان ہوتا ہے۔ خواتین کو چاہیے کہ عمومًا گھر کے جس حصے میں نماز ادا کرتی ہیں وہاں کوئی ایسی علامت لگا لیں جو کہ ان تکبیرات کی یاد دہانی کا ذریعہ بن جائے۔ لہٰذا وہ بھی باآسانی اس واجب کو ادا کر پائیں گی۔ اگر کوئی شخص یہ تکبیرات پڑھنا بھول جائے یا نماز کے فورًا بعد قصدًا وضو توڑ دے تو اب ان تکبیرات کو نہ پڑھے۔ لیکن چونکہ اس نے ایک واجب عمل کو ترک کیا اس لیے اس پر توبہ و استغفار کرنا لازم ہو گا۔

یہاں ایک حکمت کی بات بھی سمجھ لینا مفید ہو گا، وہ یہ کہ جن ایام میں یا جن مقامات پر تعظیم کے باعث نیکیوں کا اجر بڑھ جایا کرتا ہے اِن ہی مواقع پر گناہ کا وزر بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اتنے عظیم موقعے پر نیکیوں میں آگے بڑھنے کی بجائے معاصی پر گامزن رہنا شعائر اللہ کی توہین کے مرادف ہے۔ لہٰذا ان ایام میں خصوصًا اور بقیہ ایام میں عمومًا ہر طرح کی معصیت سے بچنے کا خوب اہتمام ہونا چاہیے۔ یہ کچھ وہ اعمال تھے جن کا تعلق پورے عشرے سے تھا اب چند وہ مباحث پیش کیے جاتے ہیں جن کا تعلق ۱۰ ذوالحجہ سے ہے۔

قربانی

''قربان''عربی زبان کا مصدر ہے۔اگرچہ اردو زبان میں جس عمل کو قربانی سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کے لیے عربی زبان میں ''أضحيّة''کی اصطلاح مستعمل ہے۔اس کی جمع ''أضاحي'' آتی ہے اور اسی نسبت اس عید کو بھی عید الاضحیٰ کہا جاتا ہے۔قرآن مجید نے سورۂ مائدہ میں ہابیل و قابیل کے واقعے میں قربانی کا لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الآخَرِ﴾''جب دونوں نے قربانی پیش کی اور ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی''۔(المائدۃ:۲۷)علامہ آلوسی رحمہ اللہ روح المعانی میں اس مقام پر قربانی کی تعریف بایں الفاظ ذکر کرتے ہیں: ما يتقرب به إلى الله تعالى من ذبيحة و غيرها''قربانی اس شے کا نام ہے جس کے ذریعے سے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے''۔پچھلی امتوں میں بھی قربانی کا ایک خاص طریقہ رائج تھا جسے ''سوختنی قربانی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔کچھ خاص مقامات طے ہوتے تھے جہاں جاکر لوگ اپنی اپنی قربانی پیش کیا کرتے تھے۔اور اگر وہ قربانی عند اللہ مقبول ہوتی تو بطورِ علامت آسمان سے ایک آگ آکر اس کو جلا دیا کرتی تھی۔اس امت کے لیے نفسِ قربانی تو برقرار رہی مگر یہ خاص طریقہ منسوخ ہوگیا۔اور یہ اس امت پر اللہ رب العزت کا خاص فضل و انعام ہے کہ قبولیت و عدمِ قبولیت کو چھپاکر سب کو عدمِ قبولیت کی رسوائی سے بچالیا۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو روزِ قیامت کی رسوائی سے بھی بچائے۔آمین

فضیلتِ قربانی

چونکہ ہم ایک مادہ پرست دور میں زندہ ہیں اور آج ہر شے مال کے اعتبار سے تولی جاتی ہے، اس لیے قربانی بھی وسائل کا ضیاع نظر آتی ہے۔بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ اتنا خون بہانے سے تو بہتر ہے کہ کسی تنگدست کی مدد کردی جائے۔تو اصولی بات ذہن نشین کرلینی چاہیے،کہ ہمارے دین نے بعض اعمال چند اوقات کے ساتھ خاص کردیے ہیں۔ایسے ہی اعمال کو اصولیّین ''الواجب المقيّد'' سے تعبیر کرتے ہیں۔اب اگر کوئی شخص ان اوقات میں تمام اچھے کام انجام دے مگر اس واجب کو ادا نہ کرے جو ان کے ساتھ خاص ہے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس نے کوئی نیکی نہیں کی۔ان اوقات میں اصلًا

اس واجب ہی کو سر انجام دینا نیکی کہلائے گا۔ بعینہ یہ معاملہ قربانی کا ہے۔ اگر کوئی شخص یوم النحر کو ہزاروں تنگدستوں کی مدد کردے تب بھی نہ وہ قربانی کے اجر کو پہنچ پائے گا اور نہ اس پر سے اس کا وجوب ساقط ہوگا۔ ارشادِ نبوی ہے: «مَا عَمِلَ آدَمِيٌّ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ أَحَبَّ إِلَى اللهِ مِنْ إِهْرَاقِ الدَّمِ، إِنَّهُ لَيَأْتِي يَوْمَ القِيَامَةِ بِقُرُونِهَا وَأَشْعَارِهَا وَأَظْلاَفِهَا، وَأَنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ أَنْ يَقَعَ مِنَ الأَرْضِ، فَطِيبُوا بِهَا نَفْسًا» (سننِ ترمذی) ''یوم النحر کو ابن آدم کا کوئی عمل بھی اللہ کے نزدیک خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ بے شک وہ جانور قیامت کے روز اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا۔ نیز قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے ہی اللہ کے یہاں شرفِ قبولیت حاصل کرلیتا ہے۔ لہذا خوب خوش دلی سے قربانی کیا کرو''۔

بقیہ جانوروں کے برعکس اونٹ کو کھڑے کھڑے ہی حلقوم پر چھری ماری جاتی ہے۔ قربانی کے اس خاص طریقے کو نحر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہذا اس روز کو یوم النحر بھی کہا جاتا ہے۔ روایت میں فرمایا گیا کہ ابھی زمین پر خون کا پہلا قطرہ نہیں گرتا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ قربانی شرفِ قبولیت حاصل کرلیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قربانی کرنا تقوے کا اظہار ہے۔ اور تقوی افعالِ قلوب میں سے ہے۔ تو اللہ تعالیٰ تو ویسے ہی دلوں کے حال سے واقف ہوتے ہیں اور ان کے نزدیک اصل اہمیت اسی اخلاص و تقوی کی ہوتی ہے۔ اسی بات کو قرآنِ مجید نے بایں الفاظ ذکر فرمایا: ﴿لَنْ يَّنَالَ اللهَ لُحُوْمُها وَلَا دِمَآئُها وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ (الحج: ۳۷) ''اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان (جانوروں) کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمھارا تقوی پہنچتا ہے''۔ آخر میں فرمایا کہ اس قربانی کو خوش دلی سے انجام دیا کرو۔ یعنی قربانی کرتے وقت نہ کسی مشقت کا احساس ہونا چاہیے اور نہ ہی کسی کراہیت کا۔ آج کل ایک عجیب رویہ چل پڑا ہے کہ بعض لوگ اپنے آپ کو اتنا مہذّب سمجھتے ہیں کہ جانور ذبح کرنے کے اس عمل سے کراہیت کھاتے ہیں۔ خون بہانے کو بھی کوئی غیر مہذّب کام سمجھا جاتا ہے۔ جاننا چاہیے کہ یہ رویہ ایک بد عملی ہی نہیں بلکہ تجدد و گمراہی ہے۔ بندۂ مومن تو ہر صورت میں اللہ کے حکم کا پابند ہے۔ جانور ذبح کرنا تو نسبتاً آسان بات ہے، اگر اللہ کا حکم ہو تو اہل ایمان تو میدانِ جہاد میں انسانوں کی گردنیں مارنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔ نیز اگر قربانی کرنے میں کچھ مشقت بھی ہو تو اسے گوارا کرلینا چاہیے کیونکہ یہ مشقت بھی روزِ قیامت اجر کا باعث بنے گی۔

ترکِ قربانی پر وعید

جہاں اس عظیم عبادت کو سرانجام دینے پر بہت سے فضائل وارد ہوئے ہیں وہیں بلا عذر اس کے ترک کرنے پر بڑی وعیدیں بھی سنائی گئی ہیں۔ارشادِ نبوی ہے:«مَنْ وَجَدَ سَعَةً فَلَمْ يُضَحِّ فَلَا يَقْرَبَنَّ مُصَلَّانَا» (مسندِ احمد)"جو شخص وسعت رکھنے کے باوجود بھی قربانی نہ کرے تو ہمارے مصلے (عید گاہ) کے قریب نہ آئے"۔اس روایت سے ایک تو اس عمل کے بلا عذر ترک کرنے کی کراہیت کا اندازہ ہو جاتا ہے،اور دوسرا ایک اہم فقہی اصطلاح کی طرف اشارہ بھی مل جاتا ہے۔یہ بات تو طے ہے کہ کسی بھی لفظ کے اصطلاحی معنی قرآن و سنت سے نہیں اس فن کے ماہرین کے اتفاق سے طے ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات کچھ اصطلاحات کے اشارے نص میں مل جایا کرتے ہیں۔جیسے کہ اس روایت سے معلوم ہوا کہ قربانی ہر صاحبِ وسعت پر واجب ہے۔مزید یہ کہ "مَنْ"اس مفہوم کو ادا کر رہا ہے کہ ہر صاحبِ وسعت کی وسعت کا علیحدہ اعتبار ہو گا،اور ہر صاحبِ استطاعت پر علیحدہ قربانی واجب ہوتی ہے نہ کہ ایک گھر سے ایک بکری۔قربانی کا فقہی درجہ متعیّن کرنے میں اول دور سے کچھ نہ کچھ اختلاف رہا ہے۔احناف کے نزدیک ہر صاحبِ وسعت پر علیحدہ علیحدہ قربانی کرنا واجب ہے۔جبکہ بقیہ ائمہ اسے سنتِ مؤکّدہ جانتے ہیں۔[۳]

جاری ہے

حوالہ جات

(۱) فالمستحب لمن قصد أن يضحي عند مالك والشافعي أن لا يحلق شعره، ولا يقلم ظفره حتى يضحي، فإن فعل كان مكروها. وقال أبو حنيفة: هو مباح، ولا يكره، ولا يستحب. وقال أحمد: بتحريمه كذا في رحمة الأمة في اختلاف الأئمة. وظاهر كلام شراح الحديث من الحنفية أنه يستحب عند أبي حنيفة(مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، كتاب الصلاة، باب في الأضحية)

(۲) أما صفته فإنه واجب.وأما عدده وماهيته فهو أن يقول مرة واحدة...وأما وقته فأوله عقيب صلاة الفجر من يوم عرفة وآخره في قول أبي يوسف ومحمد – رحمهما الله تعالى – عقيب صلاة العصر من آخر أيام التشريق.(الفتاوى الهندية، كتاب الصلاة، الباب السابع عشر في صلاة العيدين، تكبيرات أيام التشريق)

(وقالا بوجوبه فور كل فرض مطلقا) ولو منفردا أو مسافرا أو امرأة لانه تبع للمكتوبة (إلى) عصر اليوم الخامس (آخر أيام التشريق، وعليه الاعتماد) والعمل والفتوى في عامة الامصار وكافة الاعصار. (الدر المختار، كتاب الصلاة، باب العيدين)

(۳) يجب أن يعلم أن الشاة لا تجزئ إلا عن واحد، وإن كانت عظيمة، والبقر والبعير يجزي عن سبعة إذا كانوا يريدون به وجه الله تعالى. (الفتاوى الهندية، كتاب الأضحية، الباب الثامن فيما يتعلق بالشركة في الضحايا)

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

بیت المقدس کا تاریخی خاکہ (۱۱)

صلیبی جنگوں سے پہلے عالمِ اسلام کی صورت حال

پچھلی قسط میں ہم نے خلافتِ عباسیہ کے پہلے دور کا ذکر کیا تھا جو قوت و شوکت والا تھا۔ یہ ۱۳۲ سے ۲۴۷ ہجری (۷۴۹-۸۶۱ عیسوی) تک محیط ہے۔ اس کا خاتمہ المتوکل کے دور کے خاتمے پر ہوتا ہے۔

دوسرا دور ۲۴۷ ۔ ۶۵۶ھ (۸۶۲ ۔ ۱۲۵۸ عیسوی) تک پھیلا ہوا ہے جس کا خاتمہ سقوطِ بغداد پر ہوتا ہے۔ اگرچہ عباسی دور کی ابتدا ہی میں خلافت کے مرکزی ادارے سے آزاد ریاست اندلس (۱۳۸ھ ۷۵۵ عیسوی) اور اس کے بعد چند مزید ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ لیکن دوسرے دور میں تحریکوں اور ریاستوں کی بھرمار ہوگئی۔ ان ریاستوں میں باہم لڑائیاں جاری رہا کرتیں جن سے امتِ مسلمہ بہت کمزور ہوئی۔ منگولوں اور صلیبیوں کے حملے مسلمانوں کے اسی ضعف کا نتیجہ تھے۔ بطور نمونہ ہم چند ریاستوں کا ذکر کرتے ہیں اس سے صلیبی جنگوں کے سلسلے کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

ریاستِ طولونیہ (۲۵۴۔ ۲۹۲ھ/۸۶۸۔ ۹۰۵ء)

مصر عباسیوں کے ترک امیر احمد بنِ طولون نے اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔ بعد میں انھوں نے شام پر بھی قبضہ کرلیا۔ طولونیہ نے روم کے خلاف جہاد میں بھی حصہ لیا۔ ابتدا میں یہ عباسیوں کے دوست رہے لیکن بعد میں کچھ عرصہ دشمنی رہی۔

قرامطہ (۲۸۷۔ ۴۷۰ھ/۹۰۰۔ ۱۰۷۷ عیسوی)

قرامطہ باطنی فرقہ تھا۔ یہ شام، عراق، حجاز اور بحرین کے بعض علاقوں پر ایک عرصہ قابض رہے۔ یہ ایک گمراہ فرقہ

تھا۔ انھوں نے مکہ پر قبضہ کرکے حاجیوں پر ظلم وستم کیے۔ قبیلہ بنو عبد القیس سے تعلق رکھنے والے سردار عبداللہ العیونی نے عباسیوں اور سلجوقیوں کی مدد سے ان کا خاتمہ کیا اور بحرین میں سلطنتِ عیونیہ کی بنیاد رکھی۔

فاطمی خلافت (۲۹۷-۵۶۷ھ/۹۰۹-۱۱۷۱ء)

یہ رافضی شیعہ تھے جو فاطمی ہونے کے دعوے دار تھے۔ یہ خود کو خلیفہ اور امیر المومنین کہلاتے۔ ان کی تحریک کی ابتدا یمن سے ہوئی اور یمامہ، بحرین مصر، قیروان اور پورے شمالی افریقہ پر قابض ہوگئے۔ اہلِ سنت سے خاص دشمنی رکھتے تھے۔ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں ان کا خاتمہ ہوا۔

سلطنتِ سامانیہ (۲۶۱-۳۹۰ھ/۸۷۴-۱۰۰۰ء)

سامانیہ فارسی رافضی شیعہ خاندان تھا۔ عہدِ مامون میں یہ سمرقند اور فرغانہ وغیرہ کے امیر تھے۔ بعد میں انھوں نے خراسان، سجستان اور رَے وغیرہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ طبرستان میں قائم زیدیہ حکومت پر اور صفاریہ پر بھی قبضہ کیا۔ غزنویوں اور ترکوں کے ہاتھوں ان کی ریاست کا خاتمہ ہوا۔

آل بُوَیہ (۳۳۴-۴۴۷ھ/۹۴۵-۱۰۵۵ء)

آل بُوَیہ، دَیلم کے علاقے سے آیا ہوا ایک شیعہ خاندان تھا۔ اس کے جد پہلے عباسی فوج کے افسر بنے۔ پھر رے، ہمذان، اصفہان طبرستان اہواز وغیرہ پر ان کا غلبہ ہوا، پھر بغداد پر ان کا اثر و رسوخ ایسا قائم ہوا کہ خلیفہ ان کے زیرِ دست ہو گیا۔ ان کا دور سو سال سے کچھ اوپر ہے۔ اس دوران خلیفہ کے پاس کوئی اختیار نہ تھا۔ وہ برائے نام سلطان تھے اور بُوَیہ امرا اصل حاکم تھے جو اپنی مرضی سے نظام سلطنت چلاتے اور خلفا کو تبدیل کرتے رہتے تھے۔

سلجوقی دور (۴۳۲-۵۸۳ھ/۱۰۴۰-۱۱۸۷ھ)

آلِ سلجوق ترکستان کا ایک ترک سنی قبیلہ تھا۔ اس نے سامانیوں کے حکومت کے زوال کے بعد طبرستان، کرمان،

دَیلم، خوارزم، اصفہان، نیشاپور اور رَے وغیرہ پر قبضہ کر لیا۔ طغرل بک کو اپنا بادشاہ بنا کر انھوں نے اپنی مملکت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ ۴۴۸ ہجری میں طغرل بک بغداد میں داخل ہوئے اور رافضی شیعہ بنو بُوَیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ان کی حکومت عراق، ماوراء النہر، کرمان، خراسان، ایران، کردستان شام، ایشیاے کوچک تک پھیلی ہوئی تھی۔ سلاجقہ؛ عباسی خلفا کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتے تھے اور ایک طرح سے ان کے محافظ کا کردار ادا کرتے تھے۔

خوارزم شاہی دور (۴۷۰۔۶۲۸ھ /۱۰۷۷۔۱۲۳۰ء)

انوشتگین خراسان کے علاقے میں سلجوقوں کا ایک وفادار ترک مملوک اور کماندار تھا۔ سلجوقیوں نے اسے خوارزم کا حکمران بنا دیا اور اسے خوارزم شاہ کا لقب عطا کیا۔ بعد میں وہ خود مختیار ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی اولاد اس علاقے پر حکومت کرتی رہی۔ رفتہ رفتہ خراسان، رے، ماوراء النہر، کرمان سند اور غزنی پر ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ غوریوں کی سلطنت کا خاتمہ انھی نے کیا، جبکہ ان کی حکومت کا خاتمہ منگولوں کے ہاتھوں ۶۲۸ھ/۱۲۳۰ عیسوی میں ہوا۔

سلطنتِ غزنویہ (۳۴۹-۵۷۹ھ /۹۶۰ – ۱۱۸۳ء)

الپتگین سامانیوں کے مملوک اور ان کی طرف سے غزنی کے گورنر تھے۔ ان کے بعد سبکتگین گورنر بنے جنھوں نے اپنا دائرہ اقتدار وسیع کیا۔ سبکتگین کے پوتے سلطان محمود غزنوی نے سلطنت کو مستحکم کیا اور سامانیوں کی حکومت کو ختم کیا۔ انھوں نے ماوراء لنہر، اصفہان، ایران کے کچھ علاقے اور خراسان سے لے کر ہندوستان اور کشمیر تک اپنی مملک کو پھیلایا۔

سلطنتِ غوری (۵۴۳-۶۸۶ھ /۱۱۴۸-۱۲۸۷)

غور، ہرات اور غزنی کے درمیان کا ایک علاقہ ہے۔ یہ غزنویوں کے زیرِ تسلط تھا۔ غزنویوں کی طرف سے عزالدین حسین یہاں کے گورنر تھے جو بعد میں خود مختار ہو گئے۔ سلطنتِ غزنی کے کمزور ہونے پر انھوں نے ۵۸۲ھ میں غزنی اور دیگر علاقوں پر قبضہ کیا اور ہندوستان پر بھی کامیاب حملے کیے۔

سلطنتِ زنگی (۵۱۱-۶۶۰ھ/۱۱۲۷-۱۲۶۱ء)

یہ ایک ترک خاندان تھا عماد الدین زنگی اس کے بانی تھے۔ عماد الدین زنگی کے والد سلجوقیوں کے مملوک تھے جو ایک بڑے کماندار بن گئے تھے۔ عماد الدین زنگی کو سلجوقی سلطان تُتُش بن الپ ارسلان نے موصل کا والی بنایا جہاں سے انھوں کئی سال رومیوں کے خلاف جہاد کیا اور مسلمانوں کے بعض علاقے ان سے آزاد کروائے۔ ان کی موت کے بعد موصل کی حکومت ان کے بیٹے سیف الدین غازی کے حصے میں آئی۔ یہاں ان کی اولاد حاکم رہی۔ یہاں تک کہ ۶۶۰ھ/۱۲۶۱ء میں منگولوں نے اس کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ دوسرے بیٹے نور الدین محمود زنگی کے حصے میں حلب کی حکومت آئی۔ صلاح الدین ایوبی انھی کے ایک سالار تھے۔ نور الدین زنگی اور صلاح الدین نے صلیبی جنگوں میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ نور الدین زنگی کے انتقال کے بعد یہ علاقہ صلاح الدین ایوبی کے زیرِ اقتدار آگیا۔

سلطنتِ ایوبی (۵۶۷ – ۶۴۸ھ/۱۱۷۱ – ۱۲۵۰ء)

ایوبی خاندان ایک کرد خاندان تھا جو آذربائیجان سے ہجرت کر کے عراق میں آباد ہوا۔ اس کے ایک سپوت نجم الدین ایوب ابتدا میں تکریت اور بعد میں موصل اور دمشق کے والی بنے نجم الدین ایوب اور ان کے بھائی اسد الدین شیرکوہ نور الدین زنگی کے اہم امیر تھے۔ نجم الدین کے بیٹے یوسف بن ایوب تھے جو صلاح الدین کے نام سے مشہور ہوئے۔ اسد الدین شیرکوہ نور الدین زنگی کی طرف سے مصر کے والی تھے۔ اسد الدین کی موت کے بعد نور الدین زنگی کی طرف سے صلاح الدین کو مصر کا والی بنا دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد وہ مصر کے مستقل حاکم بن گئے اور نور الدین زنگی کی موت کے بعد دمشق، بلادِ شام، حجاز، یمن، تیونس اور سوڈان وغیرہ بھی آپ کے زیرِ نگیں آ گئے۔ ۵۸۹/۱۱۹۳ میں صلاح الدین کا انتقال ہوا۔ ان کے کچھ عرصے بعد ان کی ریاست کا خاتمہ ہوا اور مملوکوں نے حکومت سنبھالی۔

جاری ہے

****

مولانا حماد احمد ترک

نائب مدیر، ماہنامہ مفاہیم، کراچی

سفر نامۂ ترکی (۴)

یقیناً قارئین بے تابی سے منتظر ہوں گے کہ یمنی ریستوران میں ایسا کیا پیش کیا گیا جو ہمارے لیے غیر متوقع تھا، تو آپ کا انتظار ختم کیے دیتے ہیں۔ قارئینِ کرام حضر موت ہوٹل میں کھانے کے اختتام پر دودھ پتی چائے پیش کی گئی، اور چائے بھی ایسی کہ بوڑھے کو جوان اور مفلوج کو متحرک کردے۔ سبحان اللہ! کیا بات تھی اس چائے کی۔ اس چائے کی تعریف پر ہم شیخ ابراہیم ذوقؔ کا ایک شعر قارئین کی نذر کرتے ہیں:

پیرِ مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوقؔ

نامرد؛ مرد، مرد؛ جواں مرد ہو گیا

آپ دارو کی جگہ "چائے" بھی پڑھ سکتے ہیں، نہ شعر کا وَزن ٹوٹے گا نہ مفہوم بدلے گا۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ اکسرائے سے واپس رہائش گاہ روانہ ہو گئے۔ اگلی صبح استاذِ محترم کی مشغولیت تھی چنانچہ ہم نے ایک اور صاحب کی رہنمائی میں سفر کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے فتحِ قسطنطنیہ پینوراما سینٹر پہنچے۔ اس احاطے میں فتح کی تفصیلات، لشکر کی تعداد اور تمام محاذوں کا حال تصاویر اور نقشوں کے ذریعے واضح کیا گیا تھا۔ مختلف شیشوں میں سلطان محمد فاتح کے عہد کے ہتھیار بھی رکھے ہوئے تھے۔ اوپر والی منزل پر ایک بہت بڑی اسکرین نصب تھی جو فتح کا پورا منظر پیش کرتی تھی۔ اس منظر میں اوپر آسمان تھا، ایک طرف دیوارِ قسطنطنیہ کہیں سے شگاف زدہ اور کہیں سالم دکھائی دیتی تھی۔ فصیلِ شہر پر بازنطینی پہرے دار دفاع کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ دوسری طرف سلطان کا لشکر، پیادے، گھوڑے،

منجنیقیں، توپیں حتی کہ توپوں سے داغے گئے گولے بھی منظر کا حصہ تھے۔ یہ سب تو اسکرین پر تھا۔ نیچے زمین پر ایک دائرے کی شکل کی آڑ تھی جس کی دوسری طرف عثمانی لشکر کی تلواریں، تیر، نیزے، ڈھالیں، پتھر، گولے اور توپیں رکھی ہوئی تھیں۔ پس منظر میں رزمیہ دھن بج رہی تھی۔ کبھی ایک طرف سپاہیوں کے حملے اور نعرۂ تکبیر کی آواز آتی تھی اور کبھی دوسری طرف سے گھوڑے ہنہناتے تھے۔ پورا منظر ایسا تھا جیسے واقعتاً ہم میدانِ جنگ میں موجود ہیں۔ باہر نکلے تو گھاس پر ایک توپ رکھی تھی۔ غرض یہ پورا احاطہ ہی فتحِ قسطنطنیہ کی تصویر تھا۔ یہاں سے روانہ ہوئے تو ہمارے میزبان ہمیں سب سے پہلے سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی قبرِ مبارک پر لے گئے۔ یہ قبرِ مبارک کسی آبادی کے درمیان واقع تھی۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے کون واقف نہیں۔ آپ ان چند صحابہ میں سے ہیں جن کی مرویات کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔ ان صحابہ کو اصطلاحاً مُکْثِرِین (کثرت سے روایت کرنے والے) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد دو بزرگوں حضرت شعبہ اور حضرت ابو سعود کی قبور پر حاضری ہوئی۔ یہاں سے ہم سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے مزار شریف پر آگئے۔ حضرت کعب وہ جلیل القدر صحابی ہیں جو تبوک میں شرکت سے رہ گئے تھے اور جن کا ذکر سورۂ توبہ میں آتا ہے۔ اس قبرِ مبارک پر بلا شبہہ انوار و تجلیات کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یہاں سے واپس ہوئے تو ایک دل چسپ منظر نظر آیا۔ ایک استاد اپنے ساتھ اسکول کے بچوں کو لیے قطار کی صورت میں مزار شریف پر حاضری کے لیے چلے آرہے تھے، واقعتاً خوش کن منظر تھا۔ بچوں کو کم سنی سے ہی یہ باور کروا دیا جائے کہ کہاں جانا مفید ہے اور کیا دیکھنا اہم ہے تو تمام عمر وہ اس تربیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حضرت کعب کی قبرِ مبارک کے ساتھ ایک اور قبر حضرت حافر کی تھی۔ یہاں سے ہم نمازِ ظہر کے لیے سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ میزبانِ رسول ﷺ سیدنا ابوایوب انصاری اس لشکر کے ساتھ تھے جسے قسطنطنیہ پر حملہ کرنے کے لیے اموی خلیفہ نے روانہ کیا تھا۔ آپ کی وفات شہر سے قریب ہی ہوئی چنانچہ آپ کو وہیں دفن کیا گیا۔ گولڈن ہارن کے قریب جسے خلیج بھی کہتے ہیں یہ مسجد قائم ہے۔ اسے ترکی میں ایوب سلطان مسجد کہا جاتا ہے۔ استنبول کی یہ قدیم ترین اور مقدس ترین مسجد سلطان محمد فاتح کے عہد میں ۱۴۵۸ء میں تعمیر کی گئی۔ مرورِ زمانہ نے اس مسجد کو کمزور کر دیا اور زلزلے سے اس کی بنیادیں تک ہل گئیں۔ ۱۷۹۸ء میں سلطان سلیم ثالث نے

اسے منہدم کرواکر دوبارہ تعمیر کروایا۔ اکثر سلاطین کی تقریبِ تاج پوشی اسی مسجد میں ہوئی۔ نمازِ ظہر ادا کر کے سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی مرقدِ مبارک پر حاضری دی۔ قلب کو پیمانہ کیا اور نورِ نبوت نے قلب کی ویران دنیا کو ایسا منور اور آباد کر دیا کہ کبھی وہاں ظلمت کا گزر بھی نہ ہوا ہو۔

یہاں سے روانہ ہوئے تو اگلی منزل ''مینیاترک'' تھی۔ مینیاترک ایک بہت بڑے پارک کا نام ہے جس کا مطلب ہے ''چھوٹا ترکی''۔ اس پارک کا قیام ۲۰۰۳ء میں عمل میں آیا، جس میں ترکی اور اس کے گرد و نواح میں واقع قدیم تاریخی عمارات کے عمدہ نمونے تیار کیے گئے ہیں۔ کل ۱۳۶/ نمونے موجود ہیں جن میں سے ۶۰/استنبول کے، ۶۳/اناطولیہ کے اور ۱۳/ بیرونِ ترکی تعمیر کیے گئے عثمانی شاہ کار شامل ہیں۔ سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، مولانا روم، ارطغرل غازی اور معمار سنان کے مزارات، قبۃ الصخراء فلسطین، آیا صوفیا، مختلف مساجد، قومی اسمبلی، عدلیہ، توپ کاپی میوزیم، کلیسا، ہوائی اڈہ، ریلوے اسٹیشن، ریلوے لائن، کپادوکیا کے نمکین پہاڑ اور ان کے علاوہ بہت سی اہم عمارات کے نمونے موجود ہیں۔ ۶۰ ہزار اسکوئر میٹر پر محیط یہ شان دار پارک استنبول کے تفریحی اور ثقافتی مقامات میں انفرادی اہمیت رکھتا ہے جہاں کسی بھی سیاح کو چند گھنٹوں میں ترکی کے اہم سیاحتی مقامات سے واقفیت حاصل ہوجاتی ہے۔ تمام نمونے اتنی مہارت سے تیار کیے گئے ہیں کہ بالکل حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ سیاحوں کی علمی استعداد میں اضافے کے پیشِ نظر یہ سہولت بھی دستیاب ہے کہ مینیا ترک کی موبائل ایپلیکیشن تیار کی گئی ہے جو ''گوگل پلے اسٹور'' سے انسٹال کی جا سکتی ہے۔ اس ایپ کی مدد سے ہر نمونے کی تاریخی و ثقافتی اہمیت معلوم کی جا سکتی ہے۔ یہ معلومات آٹھ زبانوں میں دستیاب ہیں جن میں عربی، فارسی اور انگریزی بھی شامل ہیں۔

مینیاترک کے باہر ایک ''الٹا گھر'' رکھا ہوا ہے جسے تفریحی مقام کے طور پر سیاح دیکھنے آتے ہیں۔ ہم وقت کی تنگی کے باعث اس طرف نہ جا سکے، باہر سے ہی اس الٹے گھر کی زیارت کی اور روانگی کے لیے گاڑی میں سوار ہوگئے۔ ہمارے میزبان ہمیں نمازِ عصر کے لیے ایک ایسی مسجد میں لے آئے جس کا طرز مسجدِ اقصیٰ سے مشابہ تھا۔ محراب اور ستون مسجدِ اقصیٰ کی طرز پر بنائے گئے تھے۔ اس مسجد میں بھی تین اولیاء اللہ مدفون ہیں۔ ایک قبر پر مشہور محدث حضرت سفیان بن

عیینہ کا نام درج تھا، لیکن یہ بات محلِ نظر ہے کیونکہ آپ کی وفات مکہ معظمہ میں ہوئی تھی۔

اس مسجد سے باہر آئے تو قریب ہی ساحل واقع تھا۔ چند لمحے ساحل پر گزار کر ایک معروف ''بوریک'' ریستوران میں داخل ہو گئے۔ بوریک اناطولیہ کی روایتی سوغات ہے جسے آٹے سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں مختلف چیزیں بھری جاتی ہیں: کبھی سبزی، کبھی پنیر اور کبھی گوشت۔ پکتے وقت کافی لمبا ہوتا ہے، جب مہمانوں کو پیش کیا جاتا ہے تو ٹکڑے کر کے پیش کرتے ہیں جیسے ہمارے یہاں پیٹس کی شکل ہوتی ہے اسی طرح ترکی میں بوریک کی شکل ہوتی ہے، البتہ ذائقہ پیٹس سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ بوریک سے لطف اندوز ہونے کے بعد فاتح بلدیہ کی طرف روانہ ہوئے۔ نمازِ مغرب اور کھانے کے لیے ایک جگہ قیام کیا۔ اس کے بعد کئی سالوں سے ترکی میں مقیم ایک مہربان اور شفیق ہستی جناب ڈاکٹر ندیم صاحب کی میزبانی میں ''ایمی ہا'' نامی ادارے کا دورہ کیا گیا۔ اس ادارے میں مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو جمع کیا جاتا ہے اور ان کے پیشے سے متعلق معاشرتی اصلاح کے پہلواِن پر اُجاگر کیے جاتے ہیں۔ وکیلوں، صحافیوں، طبیبوں، اساتذہ، طلبہ اور دیگر انواع کے طبقات کو یہاں مدعو کیا جاتا ہے اور عوامی فلاح و اصلاح کے حوالے سے ان کے کردار کو نمایاں کیا جاتا ہے، ان کی سابقہ خدمات کو سراہا جاتا ہے اور آئندہ کی حکمتِ عملی تیار کی جاتی ہے۔ ایک بہت وسیع آڈیٹوریم بھی موجود ہے جہاں مختلف عنوانات کے تحت خطبات اور سیمینارز کا انعقاد کیا جاتا ہے۔

یہاں سے ہم اپنی رہائش گاہ آن پہنچے۔ ڈاکٹر ندیم صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے ایک ملاقات کراچی میں ہو چکی تھی جس کی یادیں سالوں مستحضر رہیں گی، استنبول میں ان سے دوسری مرتبہ ملاقات ہوئی۔ یہاں بھی ان سے اچھی گفتگو رہی، ترکی کے سیاسی حالات پر ان سے بہت استفادہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب ہم سب کو اسی وقت کہیں لے جانا چاہتے تھے لیکن تھکن سے چور مسافروں میں کسی نئی منزل کی جستجو باقی نہیں رہی تھی، اور ڈاکٹر صاحب کو انکار بھی ممکن نہیں تھا، چنانچہ اس اِکسیر کا سہارا لیا گیا جو ہر مریض کو بھلا چنگا کر دے۔ ہمیں حکم ہوا کہ سب کے لیے چائے تیار کی جائے، اس کارِ خیر میں ڈاکٹر صاحب کی بہت سی قیمتی باتیں سننے سے ہم قاصر رہے لیکن چائے نے سب ساتھیوں میں ایک نیا عزم پیدا کر دیا۔ ایک صاحب نے کراچی سے مٹھائی کے کچھ ڈبے تحفتاً ساتھ کر دیے تھے، ان ڈبوں پر انگریزی رسم میں نجانے مٹھائی کا کیا

نام لکھا تھا لیکن ہم اسے ''سُن پاپڑی'' کہتے تھے (انگریزی رسم میں اردو لکھنے کا یہی انجام ہونا تھا)۔ بہر حال، لذتِ کام و دہن سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

یہ ایک محلہ تھا جہاں مختصر سا قہوہ خانہ، کتب خانہ اور کراٹے کلب تھا۔ تعارف یوں کروایا گیا کہ اس کلب اور قہوہ خانے کو چلانے والے اسی محلے کے وہ روشن طبع لوگ ہیں جنھیں لڑکپن میں جدید سیکیولر ترکی کو اسلامی رنگ میں رنگنے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ انھوں نے انتہائی چھوٹے پیمانے پر؛ بزرگوں کے مشورے سے، طلبہ کو جوڑنا شروع کیا۔ کتب کا تبادلہ، عمومی گفتگو، مباحثہ، خطاب وغیرہ ان کا طریقِ کار رہا جس سے انھوں نے ذہن سازی کا آغاز کیا۔ رفتہ رفتہ لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ قہوہ خانے کی آڑ میں، کتب خانے اور کراٹے کلب کے منصوبوں میں در حقیقت ذہن سازی اور افراد کی تیاری کا کام جاری رہا۔ ان کی دیکھا دیکھی دیگر قصبوں میں بھی اس نوعیت کے سلسلے چل نکلے۔ یہ طلبہ بڑے ہوئے اور ملک و قوم کے مختلف شعبوں میں پہنچے۔ جہاں بھی گئے اس مقصد کو ساتھ لے گئے۔ یوں آج کے اسلام پسند ترکی کے لیے کوششیں اور محنتیں ہوئیں۔ کسی فردِ واحد، کسی سرکاری حکم نامے اور کسی جماعت یا ادارے سے من حیث المجموع قوموں کا مزاج نہیں بدلا جا سکتا، عوامی اصلاح ہی اس تبدیلی کی واحد وجہ ہے۔ ان عالی ہمت لوگوں کی سعی و جہد کا نتیجہ تھا کہ اس کراٹے کلب اور قہوہ خانے میں موجود نوجوان کھلے عام اذانیں سن رہے تھے، روانی کے ساتھ قرآن پڑھ سکتے تھے، اسلامی علوم کا حصول کچھ مشکل نہ تھا۔ انھی محنت کشوں میں ایک نام محمد علی صاحب کا تھا۔ ادھیڑ عمری میں بھی جذبہ جوان اور حوصلہ بلند تھا۔ علی صاحب ہمیں اپنے گھر لے گئے، مہمان نوازی بھی کی اور اپنے قیمتی خیالات سے مستفید بھی کیا۔ یہاں سے فارغ ہوئے تو رات گہری ہو چکی تھی، رہائش گاہ واپس پہنچے اور سونے کے لیے دراز ہو گئے۔

اگلے دن یعنی ۷ نومبر کو ترکی کے ایک بڑے اور تاریخی شہر بورصا روانگی تھی۔ نمازِ فجر اور ناشتے کے بعد ضروری سامان جمع کیا، بورصا میں سردی کا امکان تھا اس لیے جیکٹ اور چھتری ساتھ لے کر باہر آ گئے۔ یہاں ایک سیاحتی ادارے کی گاڑی اور میزبان ہمارے منتظر تھے۔ میزبان ترکی زبان ہی جانتے تھے اس لیے ایک رہبر اور مترجم بھی ساتھ تھے جو عربی اور انگریزی روانی سے بول سکتے تھے۔ استنبول سے بورصا کا سفر شروع ہوا۔ بورصا انتہائی قدیم شہر ہے جو بحرِ مرمرہ کے کنارے

کافی بلندی پر واقع ہے۔ اسے کچھ عرصہ سلطنتِ عثمانیہ کا دارالحکومت ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا۔ ہماری رہائش سے بورصا تک تقریباً تین گھنٹے کا راستہ تھا۔ بورصا دیکھنے کے بنیادی طور پر تین سبب تھے: ایک راستے میں واقع طویل چیئر لفٹ جو ایک پہاڑ "اولو داغ" یعنی بلند چوٹی پر بنائی گئی ہے، دوسری بورصا کی جامع مسجد جسے ترکی میں "اولو جامی" یعنی بڑی مسجد کہتے ہیں، اور تیسرے سلطنتِ عثمانیہ کے بانی "سلطان عثمان اول" اور ان کے بیٹے "سلطان اورخان" کا مزار۔ تقریباً ایک گھنٹے کے قریب سفر کرنے کے بعد گاڑی کا رخ سمندر کی طرف ہو گیا۔ رفتہ رفتہ گاڑی ساحل کے نزدیک ہونے لگی حتیٰ کہ سمندر سے چند میٹر کا فاصلہ رہ گیا۔ بالآخر یوں لگا کہ گاڑی سمندر میں اتر جائے گی اچانک ایک غیر متوقع منظر نے حیرت میں ڈال دیا، ایسا منظر حقیقت میں تو در کنار کسی تصویر میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

جاری ہے

* * * * *

محمد عثمان خان

معاون قلم کار

امام غزالی علیہ الرحمۃ کی تصوف پر تصنیفات کا جائزہ (۳)

ایُّھاالولد

امام غزالی رحمہ اللہ کی یہ کتاب نصائح اور مواعظِ حسنہ پر مبنی ہے جو انھوں نے اپنے شاگرد کو لکھ کر ارسال کیے۔ واقعہ یہ ہوا کہ امام غزالی رحمہ اللہ کے ایک شاگرد جس نے کئی سال امام غزالی رحمہ اللہ کے پاس رہ کر علم حاصل کیا تھا اور تمام علوم سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا، اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ میں نے اتنے علوم حاصل کیے ان میں سے نہ جانے کون سا آخرت میں میرے کام آئے گا اور میری قبر کو روشن کرے گا اور کون سے ایسے علوم ہیں جو آخرت میں میرے لیے نقصان کا باعث ہوں گے۔ اگر مجھے یہ بات پتا چل جائے تو میں مضر علوم سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ اس شاگرد نے یہ تمام سولات امام صاحب کو لکھ بھیجے اور اُن سے اِن کا حل دریافت کیا۔ اس کے ان سوالات کے جواب میں امام صاحب نے یہ رسالہ تصنیف کیا۔[1] امام صاحب نے اس کتاب نصیحت میں جن اہم امور کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے وہ درج ذیل ہیں:

آداب و شرائطِ شیخ	تصوف کی حقیقت	بندگی، توکل اور اخلاص کی اصل
مناظرے کے اصول	مریض کی اقسام	نصیحت کے آداب
وعظ کی حقیقت	مطالعے کی تلقین	امرا و باشاہوں سے دوری اختیار کرنے کا بیان
تعلق مع اللہ پیدا کرنے کا طریقہ	خوراک کے ذخیرے کی ممانعت	نماز کے بعد کی دعا کا اہتمام[2]

یہ کتاب ایک ایسی جامع نصیحت ہے جو ہر استاد کو اپنے طالبِ علم کو فارغ التحصیل ہونے کے بعد لازمی کرنی چاہیے۔

اس میں آفاتِ علم و نفس کا جامع تجزیہ کرکے اس کا بہترین اور سہل علاج تجویز کیا گیا ہے۔اس کتاب کے اندر طالبِ علم کو مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ تعلق مع اللہ کو مضبوط بنانے کی نصیحت کی گئی ہے۔

مشکوٰۃ الانوار

اس کتاب کی وجہِ تالیف یہ ہے کہ امام غزالی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ "انوار ربانی" کے راز مجھ کو بتائیے جن کی طرف صرف ظاہری آیاتِ قرآنیہ اور احادیث اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً جیسے سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ زمین و آسمان کا نور ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ نورِ خداوندی کو چراغ اور زیتون کے درخت سے تشبیہ دی گئی۔ [۳] امام غزالی نے اس کو جواب میں یہ رسالہ لکھ کے ارسال کر دیا۔ یہ ایک دقیق علمی کتاب ہے جس میں تصوف اور فلسفے کی اصطلاحات کا جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ کتاب عام آدمی کے لیے سمجھنے کے اعتبار سے بہت مشکل ہے۔اس کے موضوعات درج ذیل ہیں:

اقسامِ نور	حقیقتِ نور	حقیقتِ حقائق	صلاحیتوں میں فرق مراتب کی ضرورت
ارواحِ بشریہ کا بیان	عقل کی رویت یکساں نہیں ہے	آیات کی مثالوں کا بیان [۴]	

مجموعی طور پر یہ ایک دقیق علمی کتاب ہے جس میں امام صاحب نے نورِ خداوندی پر لطیف اور عمدہ بحث کی ہے۔ یہ مباحث عامیوں کے لیے نہیں بلکہ ان افراد کے لیے ہیں جو میدانِ عقل کے شہسوار ہوں۔عامیوں کے لیے لازم ہے کہ اس نوعیت کی کتب سے احتراز کریں اور اگر پڑھنا ضروری ہو تو کسی قابل عالم سے جو اِن مسائل پر عبور رکھتا ہو درسًا پڑھیں۔

بدایۃ الہدایۃ

امام غزالی رحمہ اللہ کا یہ رسالہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ عبادات کا ہے، دوسرا حصہ اخلاق کا ہے۔ عبادات میں جو مسائل بیان ہوئے ہیں وہ سب کے سب امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کے مطابق ہیں لیکن دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے حضرات کے لیے بھی اس رسالے میں یہ جاذبیت ہے کہ اس رسالے میں جو دعائیں اور اذکار بیان ہوئے ہیں وہ سب نبی کریم ﷺ سے منقول ہیں۔ دوسرا حصہ ان اخلاق کے بیان کا ہے جو عام طور پر مضر ہیں۔ اختصار کے باوجود

اس حصے میں نہایت سود مند مضامین شامل ہیں۔[۷] اس رسالے میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:[۶]

حصہ اوّل: عبادات کے آداب کا بیان

آدابِ طہارت　　آدابِ صلاۃ　　آدابِ امامت　　آدابِ جمعہ　　آدابِ صیام

حصہ دوم: اخلاقیات

اجتنابِ معاصی کا بیان　　دل کے گناہوں کا بیان　　آدابِ طلبہ کا بیان

آدابِ صحبت و معاشرت با خدا و بندگان خدا کا بیان　　بیان رعایت حقوق و محبت

یہ کتاب ایک مومن کے لیے عظیم خزانہ سے کم نہیں۔ اس کتاب کے اندر عبادات کے مسائل، مصالح اور دیگر فوائد کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا عمدہ بیان ہے۔ آج ہم جس اخلاق باختہ معاشرے میں جی رہے ہیں اس کی ضرورت ہے کہ اسے اسلام کے اعلیٰ و ارفع اخلاقیات سے منوّر کیا جائے۔ ہمارے معاشرے میں جو شہوات زور پکڑ رہی ہیں اور معاشرے میں جنسی انارکی پھیل رہی ہے۔ اس کتاب میں اس مسئلے کا عمدہ حل ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے حلقے قائم ہوں جہاں امام صاحب کی کتب کا مطالعہ کرایا جائے۔ اگر ایسے حلقے گلی گلی، محلے محلے شروع ہو گئے تو ہم اپنے معاشرے کے اخلاق میں مثبت تبدیلی بہت جلد محسوس کریں گے۔

منہاج العابدین

منہاج العابدین امام غزالی رحمہ اللہ کی آخری تصنیف ہے۔ اس کتاب میں عبادت، علم، عمل، استقامت، اخلاص، توبہ اور عبادت پر اُبھارنے والی اور اس میں رکاوٹ بننے والی باتوں اور حمد و شکر کو ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ منہاج العابدین کو ہم امام غزالی کی باقی کتب سے یوں مختلف کہہ سکتے کہ اس کی ترتیب میں تنوع و جدت ہے۔ آپ نے اپنی علمی و عملی زندگی کا نچوڑ اس میں بیان کیا ہے۔ امام غزالی خود فرماتے ہیں کہ اگر اس کتاب پر عمل کیا جائے تو یہ ''منہاج العابدین'' (عبادت گزاروں کا راستہ) ہے۔ امام غزالی نے اس کتاب کے ذریعے دنیا کی بے ثباتی اور فکرِ آخرت کا درس دیا ہے۔ آپ کتاب کے آخر میں اپنا مدعا و مقصود یوں بیان فرماتے ہیں: ''ہم نے آخرت کے راستے پر چلنے کے متعلق بیان کا ارادہ فرمایا تھا،

الحمدللہ اس کتاب کے ذریعے ہم اپنے مقصد میں بخوبی کامیاب ہوگئے ہیں۔اب جس کا دل چاہے عمل کرے ورنہ صرف علم اس کے لیے آفت بن جائے گا۔(۷)" یہ کتاب امام غزالی کی پوری زندگی کی تعلیمات وارشادات کا خلاصہ اور فنِ تصوف کا نچوڑ ہے۔اس کتاب مین درج ذیل سات موضوعات ہیں جنھیں امام صاحب نے "گھاٹیوں" سے ملقب کیا ہے۔

علم کی گھاٹی　　توبہ کی گھاٹی　　حمد و شکر کی گھاٹی　　عوارض کی گھاٹی　　عوائق و موانع کی گھاٹی

بواعث یعنی عبادت پر ابھارنے والی چیزوں کی　　قوادح یعنی ان چیزوں کی جو عبادت میں خرابی پیدا کرتی ہیں (۸)

یہ ایک عمدہ کتاب ہے جو ایک سالک کو عبادت میں پیش آنے والی مشکلات کا سامنا کرنا سکھاتی ہے اور اسے اللہ کی اطاعت اور سنتِ رسول ﷺ پر ابھارتی ہے۔امام غزالی صوفی محض نہیں تھے، وہ انسان کی نفسیات پر گہرا عبور رکھتے تھے۔اس کتاب میں انھوں نے انسان کے نفس کی جانب سے اسے پھسلانے کے لیے جو کچھ حیلے بہانے بن سکتے تھے انھیں بیان بھی کیا اور ساتھ ساتھ اس کا علاج بھی تجویز فرمایا ہے۔

نصیحۃ الملوک

"اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے، حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھین لیتا ہے۔آج کل ہمارے ملک میں حکومت کی کھینچا تانی جاری ہے۔جو پہلے ہنس رہے تھے، آج رو رہے ہیں اور جو آج ہنس رہے ہیں، وہ کل روئیں گے۔اس دنیا کی حکمرانی اور کامیابی دائمی ہے نہ ہی زوال اور ناکامی۔یہ دنیا کا تاج و تخت بس جھولے کی ایک سواری ہے، جس پر لوگوں نے باری باری چڑھنا اور اترنا ہے۔جس کے چڑھنے کی باری ہوتی ہے، وہ خوشی سے خوب چھلانگیں لگاتا ہے اور جس نے اترنا ہوتا ہے، اسے بلا اختیار رونا آرہا ہوتا ہے۔ایسے ماحول میں خود بخود بندے کا ذہن اُن قیمتی نصائح کی طرف چلا گیا، جو گزشتہ دور میں ہمارے بزرگ اپنے وقت کے حکمرانوں کو بہت ہی دردِ دل کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔مشہور عالم، فقیہ اور صوفی بزرگ ابو حامد محمد بن محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۰۵ھ) نے تو اپنے وقت کے بادشاہ محمد بن ملک شاہ سلجوقی کو بہت ہی مخلصانہ انداز میں، انتہائی قیمتی مواد پر مشتمل پورا ایک رسالہ لکھا تھا، جو اصل تو فارسی زبان میں تھا لیکن اب اس کا عربی ترجمہ ہی دستیاب ہے، جو بیروت کے مشہور ناشر دار الکتب العلمیہ نے " التبر المسبوک فی نصیحۃ الملوک" کے نام سے

ایک سوبتیس صفحات میں شائع کیا ہے"۔[9]

مشہور محدث اور صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۰۵۲ھ) کی تصنیفات میں بھی ان کے ایک رسالے کا تذکرہ ملتا ہے، جس کا نام " ترجمۃ الاحادیث الاربعین فی نصیحۃ الملوک والسلاطین " ہے۔ اس موضوع پر متفرق بھی جتنی نصائح اور واقعات عربی میں ملتے ہیں، ان سے باآسانی ایک جامع کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ پھر یہ نصائح ایسی جامع ہیں کہ دین و دنیا کے ہر گوشے پر محیط ہونے کے ساتھ ساتھ ان میں ہر خاص و عام کے لیے عبرت کا بہت بڑا سامان موجود ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کچھ نہ کچھ "بادشاہ" ہوتا ہے اور اس کے ماتحت اُس کی "رعایا" بھی ہوتی ہے۔ کوئی شخص کسی ادارے، محکمے، شہر یا گاؤں کا "بادشاہ" ہوتا ہے اور کوئی صرف اپنے گھر کا۔ اس لیے ان نصائح کو یہ سوچ کر نہیں پڑھنا چاہیے کہ یہ صرف ملکی سطح کے حکمرانوں کے لیے ہیں اور ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ ہم میں سے ہر ایک ان ہدایات و تعلیمات کا محتاج اور ضرورت مند ہے۔ بہر حال! اس سلسلے کے چند ایمان افروز نمونے اردو ترجمے[10] کی شکل میں یہاں قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں:

(۱)...امیر المومنین سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو خط لکھا اور اس میں درخواست کی کہ آپ مجھے کچھ نصیحت اور وصیت فرمائیں لیکن بات مختصر اور جامع ہو، بہت طویل نہ ہو، حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ان کو یہ مختصر خط لکھا:

سلام علیک! أما بعد فإني سمعت رسول اللّٰه ﷺ یقول: مَنِ التمس رضاء اللّٰه بسخط الناس کفاه اللّٰه مونة الناس و من التمس رضاء الناس بسخط اللّٰه و کله اللّٰه إلی الناس والسلام علیک

" سلام ہو تم پر۔ اما بعد! میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی اللہ کو راضی کرنا چاہتا ہے لوگوں کو اپنے سے خفا کر کے، تو اللہ لوگوں کی طرف سے اُسے کافی ہو جاتے ہیں یعنی اُسے لوگوں سے بے نیاز کر دیتے ہیں، اور جو کوئی بندوں کو راضی کرنا چاہے گا اللہ کو ناراض کر کے تو اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں کے سپرد کر دیں گے یعنی انھی لوگوں کے ذریعے پھر اس کی ذلت کا سامان ہو گا"۔[11]

(۲)...اپنی حکومت کو خلافتِ راشدہ کے طرز پر عدل وانصاف سے چلانے والے عظیم حکمران حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد اپنے وقت کے عظیم محدث و مفسر حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس خط روانہ کیا کہ وہ انصاف کرنے والے حکمران کے اہم اوصاف اور امتیازی خصوصیات لکھ کر ان کو بھیج دیں، چنانچہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے ان کے نام اپنے خط میں لکھا: ”اے امیر المومنین! آپ جان لیجیے اللہ رب العزت نے امامِ عادل (انصاف پسند حکمران) کو ہر ٹیڑھے کو سیدھا کرنے والا، ہر ظالم کو راہِ راست پر لانے والا، ہر فاسد کی اصلاح کا ذریعہ، ہر ضعیف کی قوت، ہر مظلوم کے لیے انصاف اور ہر غم زدہ کی پناہ گاہ بنایا ہے۔ اے امیر المومنین! امامِ عادل (انصاف پسند حکمران) اُس چرواہے کی طرح ہے جو اپنے اونٹوں پر شفقت کرنے والا اور ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے والا ہو، جو ان کے لیے بہترین چراگاہ کا متلاشی رہتا ہو، ہلاکت کی چراگاہوں سے انھیں دور رکھتا ہو، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہو اور گرمی و سردی کی تکلیف سے انھیں بچاتا ہو۔ اے امیر المومنین! امامِ عادل (انصاف پسند حکمران) اُس باپ کی طرح ہوتا ہے جو اپنی اولاد پر شفقت کرتا ہے، کم عمری کی حالت میں ان کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہے، بڑے ہونے کی حالت میں ان کو تعلیم دیتا ہے، زندگی بھر اُن کے لیے روزی کماتا ہے اور مرنے کے بعد انھیں کے لیے جمع کر جاتا ہے۔ اے امیر المومنین! امامِ عادل (انصاف پسند حکمران) اُس شفیق نیک اور اپنے بیٹے کے ساتھ مہربان ماں کی طرح ہے، جس نے اسے بڑی مشقت کے ساتھ پیٹ میں رکھا، بڑی مشقت کے ساتھ اسے جنا اور بچپن میں اسے پالا۔ اُس کے جاگنے سے وہ ماں خود بھی جاگتی ہے، اُس بچے کے سکون سے اسے بھی سکون ملتا ہے، کبھی اسے دودھ پلاتی ہے اور کبھی چھڑاتی ہے، اس کے آرام سے خوش ہوتی ہے اور اس کی تکلیف سے خود بھی غم زدہ ہو جاتی ہے۔ اے امیر المومنین! امامِ عادل (انصاف پسند حکمران) یتیموں کا والی، مسکینوں کی خاطر ذخیرہ کرنے والا ہوتا ہے، وہ اُن کے چھوٹوں کی پرورش کرتا ہے اور بڑوں کی کفالت کرتا ہے۔ اے امیر المومنین! امامِ عادل (انصاف پسند حکمران) اس دل کی طرح ہے جو پسلیوں کے درمیان ہے، جس کی درستی سے تمام اعضا درست رہتے ہیں اور اس کے بگڑنے سے تمام اعضا بگڑ جاتے ہیں۔ اے امیر المومنین! امامِ عادل (انصاف پسند حکمران) اللہ اور بندوں کے درمیان منتظم ہوتا ہے، اللہ کا کلام سیکھتا ہے اور بندوں کو سکھاتا ہے، اللہ کو دیکھتا ہے اور

انھیں دکھاتا ہے، اللہ کا مطیع ہوتا ہے اور انھیں مطیع بناتا ہے۔ لہٰذا اے امیر المومنین! آپ ان چیزوں میں جن کا اللہ نے آپ کو مالک بنایا ہے اُس غلام کی طرح مت ہوجائیں جس کو اس کے آقا نے امین بنا دیا اور اس سے اپنے مال کی حفاظت چاہی اور اس نے مال تباہ و برباد کر دیا، اہل و عیال کو دھتکار دیا اور گھر والوں کو محتاج بنا دیا اور اس کے مال کو تقسیم کر دیا۔ اے امیر المومنین! یہ بھی جان لیں کہ اللہ رب العزت نے کچھ حدود نازل فرمائی ہیں، تاکہ ان کے ذریعے بے حیائی اور برے کاموں سے روکا جائے، تو کیا حال ہو گا اگر حاکم ہی ان برائیوں کا مرتکب ہو؟ اور یہ کہ اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کے لیے قصاص کو زندگی کا ذریعہ بنایا ہے تو کیا حال ہو گا اگر وہی شخص قاتل بن جائے جو ان سے قصاص لینے والا ہو۔ اے امیر المومنین! موت اور اس کے بعد کو اور اُس وقت اپنے بے یار و مددگار ہونے کو یاد کریں، لہٰذا موت اور اُس کے بعد سخت گھبراہٹ کے وقت کے لیے سامان جمع کر لیں۔ اے امیر المومنین! جان لیں کہ آپ کے لیے آپ کے اُس گھر کے علاوہ جس میں آپ ہیں ایک گھر اور ہے، جس میں آپ کو طویل مدت تک ٹھہرنا ہے، آپ کے احباب آپ کو تنِ تنہا اس گھر کے ایک گڑھے کے سپرد کر کے آپ سے جدا ہو جائیں گے۔ لہٰذا اُس دن کے لیے آپ ایسے اعمال تیار کر لیں جو آپ کا ساتھ دیں، وہ ایسا دن ہو گا جس دن آدمی اپنے بھائی سے، اپنی ماں سے، اپنے باپ سے، اپنی بیوی سے اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ اے امیر المومنین! یاد کریں کہ جب قبروں میں موجود مردے زندہ کیے جائیں گے اور جو کچھ دلوں میں ہے وہ سب ظاہر ہو جائے گا اور تمام چھپے ہوئے راز کھل جائیں گے۔ نامۂ اعمال انسان کے کسی چھوٹے عمل کو چھوڑے گا اور نہ ہی بڑے عمل کو۔ اے امیر المومنین! اپنے مقررہ وقت کے آنے سے پہلے اور زندگی کی امیدوں کے ختم ہو جانے سے پہلے آپ مہلت کے وقت میں ہیں۔ آپ نہ تو جاہلوں جیسا فیصلہ کریں نہ ہی لوگوں کو ظالموں کے راستے پر چلائیں اور نہ ہی طاقت ور لوگوں کو کمزوروں پر مسلط ہونے دیں کہ یہ ظالم لوگ کسی مومن کے بارے میں نہ تو رشتے داری کا لحاظ رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی عہد و وعدہ کا۔ یاد رکھیں! آپ ہی اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائیں گے اور ساتھ ہی اُن لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی برداشت کریں گے جنھوں نے آپ کے کہنے پر گناہ یا ظلم کیا۔ آپ اُن لوگوں کے دھوکے میں ہرگز نہ آئیں جو ایسے مال سے عیش کرتے ہیں جس میں آپ کا نقصان ہے اور وہ لوگ آپ کی آخرت کو برباد کر کے دنیا کی لذتوں میں مزے اڑاتے ہیں۔ آپ اپنی آج کی

طاقت کو نہ دیکھیں بلکہ اپنی اُس وقت کی حالت کو دیکھیں جب آپ موت کے جال میں پھنسے ہوں گے یا پھر اُس وقت کو یاد رکھیں جب آپ فرشتوں اور انبیاعلیہم السلام کے مجمعے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں گے، اس حال میں کہ تمام چہرے اللہ حیّ وقیوم کے سامنے جھکے ہوں گے۔اے امیر المومنین! میں آپ کو ویسی نصیحت تو نہیں کر سکا جیسے مجھ سے پہلے عقل مند لوگوں نے اپنے وقت کے حکمرانوں کو کی تھی، لیکن میں نے شفقت اور آپ کی خیر خواہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ اس خط کو اُس مہربان طبیب کی طرح سمجھیں جو مریض کو کڑوی دوائیں صرف اس لیے پلاتا ہے کہ اُسے مریض کی عافیت اور صحت کی اس سے ہی امید ہوتی ہے"۔

اس مقام پر اس مضمون کا اختتام ہوا۔ مذکورہ بالا صفحات میں ہم نے امام غزالی رحمہ اللہ کی کل آٹھ کتبِ تصوف کا ایک خاکہ پیش کیا۔اب ہم اس مضمون کا حاصل ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام

امام غزالی ایک حقیقت پسند اور غیر جانبدار شخصیت کے مالک تھے، حقائق تک رسائی کے لیے آپ نے مروجہ علوم وفنون کا از سر نو جائزہ لیا۔آپ نے تقلید ورسوم کو پھر سے پرکھا، مذاہب وفرق کی دقّت نظر سے چھان بین کی، آپ کے نزدیک حقیقی علم چاہے وہ دنیاوی یا دینی اعتبار سے ہو اپنی تہہ میں اذعان ویقین کے پیمانے رکھتا ہے، اس کے اثبات کے لیے معجزات وخوارق کی نہ صرف ضرورت نہیں بلکہ جو بات اس طرح علم کی زد میں آجائے تو وہ نظریات یا عقائد مزید کھل اور نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ان تمام دنیاوی علوم کی تعلیم کو جائز اور ضروری قرار دیا جو معاشرتی اعتبار سے لازمی ہیں جب کہ یونانی فلاسفر، لادینی عناصر، شریعت اور تصوف میں توازن، جاہل صوفیا کا رد اور گمراہ فرقوں کے عقائد کے تصورات پر آپ نے تنقید کی۔آپ کے مطابق ہر علم کا اپنا ایک معیار ہے اور اپنے اثبات کے لیے اسے کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں۔آپ رحمہ اللہ کے تصوف کی طرف مائل ہونے کی وجہ اس طائفہ کے اخلاق وعادات، روشن خیالی اور روشن ضمیری ہے کیونکہ تصوف وسلوک کی راہ پر گامزن ہونے کی شرط اول یہ ہی ہے کہ انسان کو خواہشات وجذبات کے احساسات سے اوپر اُٹھنا ہو گا، عقل وفکر اور ذہن وقلب کو ریاضتوں اور مجاہدوں سے اس طرح صقیل اور چمکانا ہو گا کہ ان پر انوار الہیہ

منعکس ہو سکیں ان کا اپنا تجربہ یہ ہے کہ جب انھوں نے اس راہ کو اپنایا تو دین کے حقائق اس طرح منکشف ہوئے کہ کوئی اس میں اشکال باقی نہ رہا اور ساتھ ہی نظری علوم و فنون کی گرہیں بھی کھلتی چلی گئی۔

ہمارا معاشرہ بھی آج طرح طرح کی گمراہیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ہمارے معاشرے کے تمام امراض کا حل تعلیمات غزالی میں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کچھ فدائیانِ غزالی آگے بڑھیں اور زبان اور قلم کی طاقت سے غزالی کے افکار کو پورے معاشرے میں پھیلا دیں۔ ایسا کرنے سے ہمارے معاشرے کے ظاہری و باطنی امراض کا خاتمہ ہو گا اور ہمارا معاشرہ مستحکم اخلاقی بنیادوں پر کھڑا ہو سکے گا ان شاء اللہ۔

حوالہ جات

[۱] الغزالی، ابو حامد محمد، ایّہا الولد، اردو ترجمہ بحوالہ مجموعہ رسائل امام غزالی، مطبوعہ ۲۰۰۴، دار الاشاعت، کراچی، جلد:۱، ص:۱۴۹

[۲] ایضا، ص۱۴۸-۱۴۷

[۳] الغزالی، ابو حامد محمد، مشکوٰۃ الانوار، اردو ترجمہ: حبیب الرحمن صدیقی، بحوالہ مجموعہ رسائل امام غزالی، مطبوعہ ۲۰۰۴، دار الاشاعت، کراچی، جلد:۱، ص:۳۹۸

[۴] ایضا، ص:۳۹۶

[۵] الغزالی، ابو حامد محمد، بدایۃ الہدایۃ، اردو ترجمہ: غلام احمد صاحب، بحوالہ مجموعہ رسائل امام غزالی، مطبوعہ ۲۰۰۴، دار الاشاعت، کراچی، جلد:۲، ص:۳۲۱

[۶] ایضا

[۷] https://www.rekhta.org/ebook-detail/minhaj-ul-aabideen-imam-mohammad-ghazali-ebooks?lang=ur

[۸] الغزالی، ابو حامد محمد، منہاج العابدین، اردو ترجمہ: محمد سعید احمد، مطبوعہ ۲۰۱۳، مکتبۃ المدینہ، کراچی، ص:۴۰

(۹) https://www.alqalamonline.org/index.php/kalma-e-haq-maulana-mansoor-ahmad/10376-654-kalma-e-haq-suno-aye-hkmurano

(۱۰) یہ تفصیلات اور ترجمہ مولانا منصور احمد صاحب کے برقی مضمون ''سنو اے حکمرانو'' سے ماخوذ ہے۔اس کا حوالہ اوپر دے دیا گیا ہے۔ یہ مضمون کلمہ حق، شمارہ ۶۵۴ میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

(۱۱) سنن ترمذی، ابواب الزہد

*****

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

فوت شدہ روزوں کا فدیہ

سوال: میں گزشتہ زندگی میں چند روزے نہیں رکھ سکا مجھے اس پر از حد ندامت ہے میں توبہ کے ساتھ اپنی پوری زندگی کے چھوڑے ہوئے روزوں کا فدیہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ ہر ایک کا فدیہ کیا ہوگا؟

واضح رہے کہ جب تک روزہ رکھنے کی طاقت موجود ہو فوت شدہ روزوں کی قضا لازم ہے، اس وقت تک فدیہ دینا درست نہیں۔ اگر بڑھاپے یا دائم المرض ہونے کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو اور صحت کی کوئی امید بھی باقی نہ ہو تو اس صورت میں فوت شدہ روزوں کا فدیہ دینا درست ہے۔ فدیے کی ادائیگی کے بعد زندگی میں کبھی بھی روزہ رکھنے کی استطاعت پیدا ہوگئی تو ان تمام روزوں کی قضا لازم ہوگی۔ ایک روزے کا فدیہ ایک صدقۂ فطر کے برابر غلہ (پونے دو کلو گندم یا ساڑھے تین کلو جو یا کھجور یا کشمش) یا اس کی قیمت ہے۔

(الف) فالشيخ الفاني الذي لا يقدر على الصيام يفطر ويطعم لكل يوم مسكينا كما يطعم في الكفارة (الفتاوى الهندية، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار)

(ب) ولو قدر على الصيام بعد ما فدى بطل حكم الفداء الذي فداه حتى يجب عليه الصوم (الفتاوى الهندية، كتاب الصوم، الباب الخامس في الأعذار التي تبيح الإفطار)

*****

سلیم احمد (۱۹۲۷ء۔۱۹۸۳ء)
معروف نقاد

نظریاتی ریاست میں ادیب کا کردار (۲)

معاف کیجیے میں اس بحث کو لمبا نہ کھینچتا، اگر اس کا میرے موضوع سے گہرا تعلق نہ ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دینی ریاست میں ادیب کا کردار، ایک نظریاتی ریاست میں ادیب کے کردار سے مختلف ہوتا ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لیے ہمیں پہلے اپنے اردگرد دیکھنا پڑے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ادب کو ریاست کے مقاصد کے لیے استعمال کرنا اشتراکی ریاستوں کا ایک ایسا امتیاز ہے جس پر بورژوا ریاستوں میں شدید ردِعمل پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اشتراکی ریاستوں نے ادیب کی آزادی کو ختم کر کے رکھ دیا ہے اور نتیجے کے طور پر وہاں آزادی کے ساتھ ادب کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ یہ صورتِ حال اتنی واضح ہے کہ پاکستان میں جب بھی نظریاتی ریاست کا مسئلہ زیرِ بحث آتا ہے اور اس کے حوالے سے ادب پر گفتگو ہوتی ہے تو ہمیشہ اس خطرے کا اظہار کیا جاتا ہے کہ آیا پاکستان میں بھی ادب پر وہی کچھ گزرے گی جو اشتراکی ریاستوں میں گزرتی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اشتراکی ریاستوں سے بھی زیادہ خراب حالات کا سامنا ہے۔ اشتراکی ریاستیں ادیب سے جو کام لیتی ہیں اس کے صلے میں ادیب کو طوقِ زرّیں بھی پہناتی ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں یہ توقع کی جاتی ہے کہ ادیب مشقت تو کرے گا مگر طوقِ زرّیں کے لیے ادیب کی گردن کبھی منتخب نہیں کی جاتی۔ عام طور پر ریاست کو اس بات سے مطلق کوئی غرض نہیں ہے کہ یہاں ادیب نام کی کوئی چیز موجود ہے یا نہیں۔ لیکن وقتاً فوقتاً آوازیں بھی اٹھتی رہتی ہیں کہ ادیبوں کو ریاست کے لیے کام کرنا چاہیے۔ گویا ریاست کو ادیب صرف اس وقت یاد آتے ہیں جب اسے اپنا مطلب یاد آتا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ ادیب ریاست کے متعلق اپنے فرائض ادا کریں۔ لیکن یہ سیدھی بات بھی بھول جاتی ہے کہ حقوق کے بغیر فرائض کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اشتراکی ریاستیں ادیبوں کو ان کا حق دیتی ہیں۔

آنجہانی اسٹالن نے ایک مرتبہ ادیبوں کو روحوں کا انجینیر کہا تھا۔ اشتراکی ریاستیں تسلیم کرتی ہیں کہ روحانی تعمیر میں حصہ لینے کی وجہ سے ادیب اہمیت اور عزت کے مستحق ہیں۔ وہاں ادب کا جو حال بھی ہوا ہو لیکن ادیب ریاست کے خوش حال اور باعزت ترین طبقوں میں سے ایک ہیں۔ ہمارے ہاں صورتِ حال اس کے برعکس یہ ہے کہ ادیب بہ حیثیت ادیب کے معاشرے کے سب سے پسماندہ طبقوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اشتراکی ریاستوں میں ادب کا چاہے خاتمہ ہو گیا ہو لیکن ادیب زندہ ہیں۔ ہمارے یہاں ادب کے ساتھ ادیبوں کا خاتمہ بھی ہو رہا ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ دونوں ٹھکانے لگ جائیں گے۔ بہرحال مجھے اس بات کی کوئی توقع نہیں ہے کہ کل کی سنہری صبح کے ساتھ ریاست ہمارے ادیبوں کو سونے کا نوالہ کھلانے لگے گی۔ اس لیے میں اپنے سوال کی طرف لوٹتا ہوں۔

اشتراکی ریاستیں ادیب سے کام لیتی ہیں، اس کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ ادیب یا تو اپنے نظریے کی برتری ثابت کرتے ہیں یا پھر یہ دکھاتے ہیں کہ ریاست نظریے کے تحت جو کچھ کر رہی ہے وہ اچھا ہی اچھا ہے۔ اسٹالن کے دور میں روسی افسانوں میں اسٹالن کو فوق الفطرت قوت کے مالک کے طور پر پیش کیا جاتا تھا اور ملک الشعراء کا خطاب ایسے شاعروں کو ملتا تھا جو ثابت کر سکیں کہ اشتراکی ریاست میں نلوں کے سلنڈر بورژوا معشوقوں کی پنڈلیوں سے زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ اشتراکی ریاستوں میں ادب کا خاتمہ یا زوال ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ آیا ادب ریاست کی ضرورتوں کو پورا کر کے ادب رہ سکتا ہے یا نہیں؟ ضروری ہے کہ ہم ریاست کے مقاصد کو بیان کریں اور پھر ان کی روشنی میں دیکھیں کہ ادب سے ان کا کوئی تعلق بنتا ہے یا نہیں۔

ریاست کے مقاصد میں امنِ عامّہ کا قیام، معاشی منصوبہ بندی، ریاست کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی، پیداوار میں اضافہ اور وہ چیزیں شامل ہیں جو ریاست کے شہریوں کی جان و مال، عزت و آبرو اور پرامن بقا کے لیے ضروری ہیں۔ ادب کا ان چیزوں سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ریاست کے یہ مقاصد جب شہریوں کی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں اور ان کا ردِعمل شہریوں میں اطمینان، مسرت، سکون یا اس کے برعکس جذبات اور کیفیات پیدا کرتا ہے تو ادب سے اس کا تعلق ہو سکتا ہے۔ اشتراکی ریاستوں کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے ادب کو اپنے مقاصد کا براہِ راست آلہ کار بنانے کی کوشش کی۔ مثال کے طور

پر ریاست نے معاشی منصوبے بنائے تو ادیبوں کا فریضہ قرار دیا گیا کہ وہ ان معاشی منصوبے کے بارے میں لکھیں یا حکومت نے عوام کو محنت پر اکسانا چاہا تو ادیبوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عوام کو "کام کرو کام" کے نغمے سنائیں۔

اس کے علاوہ اشتراکی ریاستوں میں ایک اور بنیادی خرابی ہے۔ اشتراکی نظریے میں انسانوں کی باطنی زندگی کی تہذیب و ترتیب کا کوئی اصول موجود نہیں ہے۔ یہ نظریہ انسانوں کی باطنی زندگی کے بجائے خارجی حالات ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ ادب کے تعلق سے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادب انسانوں کی باطنی تربیت، گہرے روحانی تجربات کے انکشاف اور زندگی کی حقیقی معنویت سے الگ ہو کر خارجی واقعات کی کھتونی یا ماحول کے عمل اور ردِ عمل کا اظہار بن کر رہ جاتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ دینی ریاست میں ادیب کا کردار ایک نظریاتی ریاست میں ادیب کے کردار سے مختلف ہوتا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ اس کی وضاحت کر دی جائے۔

نظریے کے برخلاف دین میں باطنی تربیت ہی سب کچھ ہے۔ اشتراکی ریاست، ہر ریاست کی طرح اپنے شہریوں کے اعمال کو دیکھتی ہے۔ جب تک اعمال اس کے مطابق ہیں، اسے اس کیفیتِ قلب سے کوئی سروکار نہیں ہوتا جسے ایمان کہتے ہیں۔ یہ وہ داخلی معاملہ ہے جس کا ریاست کے حدود و اختیار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب کہ دین میں ایمان ہی اصل چیز ہے۔ اگر کسی شخص کا اسلام کے عقائد پر ایمان نہ ہو تو خواہ اس کے اعمال ظاہری طور پر سب اسلامی ہوں وہ مسلمان نہیں کہلائے گا۔ یہاں داخلی پہلو ہی سب سے اہم ہے۔ یہ ایک بنیادی بات ہے جس کے مضمرات پر ابھی کچھ اور عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔

ریاست کا تعلق اگر ظاہری اعمال سے ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس باطنی کیفیت یعنی ایمان کو پرکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ وہ مجبور ہے کہ اپنی نظر صرف خارجی اعمال پر رکھے۔ لیکن ایک دینی ریاست میں خارجی اعمال کا کوئی اعتبار نہیں، اگر وہ اخلاص اور ایمان سے وابستہ نہ ہوں۔ اس لیے ایک دینی ریاست کا لازمی فریضہ ہے کہ وہ خارجی اعمال کے ساتھ باطنی کیفیت کو بھی جاننے اور پرکھنے کا ذریعہ پیدا کرے۔ اب مجھے کہنے دیجیے کہ یہ ذریعہ ادب اور صرف ادب ہے۔ ادب باطنی زندگی کا مقیاس الحرارت ہے اور یہ صرف ادب ہی کے ذریعے ریاست جان سکتی ہے کہ اس کے شہریوں کے نفسِ باطن اور اعمالِ قلب میں دین کتنی گہرائی تک موجود ہے۔

آپ مجھے مبالغہ آرائی کا مجرم قرار نہ دیں، تو میں کہوں گا کہ صرف ایک دینی ریاست ہی میں ادب کو وہ حیثیت مل سکتی ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ اشتراکی ریاستوں میں وہ ریاست کا آلۂ کار بن کر موت کا شکار ہو جاتا ہے جب کہ دینی ریاست میں ادیب، دین کے تابع ہے اور ریاست سے اس کی وفاداری کی بنیاد یہ ہے کہ ریاست بھی دین کی تابع ہے یعنی دونوں کے مقاصد دین کی مشترک بنیاد پر مشترک ہیں۔ لیکن اس سے دونوں کے حدودِ کار کا تعین بھی ہوتا ہے۔ ریاست کا کام دین کی ظاہری شکل کو برقرار رکھنا اور زندگی کے نت نئے تقاضوں سے اسے ہم آہنگ کرنا ہے، جب کہ ادیب کا کام باطن میں دین کی بنیادوں کو استوار کرنا اور ایمان واخلاص کی اس کیفیت کو پیدا کرنا ہے جو خارجی شکل میں معنی پیدا کرتی ہے۔

جب ہم ادب اور سیاست کے حدودِ کار کو واضح طور پر سمجھ لیں تو ہمارے لیے یہ کہنا ممکن ہو جاتا ہے کہ ایک دینی ریاست میں اپنے مشترک مقصد کی بنیاد پر ادیب اور ریاست کا کردار ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم قائدِ اعظم کو ریاست کے نمائندے کے طور پر لیں اور اقبال کو ادیب کی جگہ رکھیں تو ہم کہہ سکیں گے کہ قائدِ اعظم اور اقبال کا کام مل کر ہی اپنے مشترک مقصد کو پورا کرتا ہے۔ قائدِ اعظم نے ریاست کے ظاہری وجود کو جنم دیا جبکہ اقبال نے اسلام کی نَشْأۃُ الثانیہ کے تصور کو اپنے جذبِ باطن سے اس طرح زندہ کر دیا کہ وہ اجتماعی تجربے کی آرزو بن گیا۔

اب ہم ایک اور نقطۂ نظر سے اس بات کو آگے بڑھائیں گے۔ ریاست کا ایک اصول عدل ہوتا ہے۔ جس طرح ریاست عدل کے اصول سے منحرف ہو کر فساد کا شکار ہو جاتی ہے، اسی طرح ادب صداقت سے محروم ہو کر غیر ادب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس اصول کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ صداقت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ بیان کو امرِ واقعہ کے مطابق ہونا چاہیے، مثلاً اگر میں لکڑی کی بنی ہوئی ایک چیز کو میز کہوں اور وہ میز ہو تو یہ بات صداقت کے مطابق ہوگی۔ لیکن امرِ واقعہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک خارجی، ایک داخلی۔ خارجی کی مثال میں نے پیش کر دی۔ باطنی صداقت کے معنی یہ ہیں کہ بیان داخلی کیفیت کے مطابق ہو تو صداقت کہلائے گا۔ ادب کے لیے یہی داخلی صداقت سب سے اہم ہوتی ہے۔ اب دینی ریاست میں ادیب کا کام دین کے عناصرِ چہار گانہ یا ان میں سے کسی ایک یا زیادہ کو اپنی باطنی صداقت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔

مثال کے طور پر ان میں سے ایک عنصر اخلاقیات کا تعلق انسانوں کے باہمی رشتے سے ہے۔ ہمارے دین نے ان

رشتوں کی ساری شکلیں متعیّن کی ہیں اور انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض کا تعین کیا ہے۔ اس سے اخلاقی اقدار پیدا ہوتی ہیں، مثلاً محبت، وفاداری، ہمدردی، رواداری، ایثار، قربانی، شجاعت وغیرہ۔ اب جو ادب ان اخلاقی اقدار کو باطنی صداقت کے ساتھ پیش کرے گا وہ دین کی ضرورت کو پورا کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادیب کو ان اقدار کو پہلے اپنے تجربے میں صادق بنانا ہو گا۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک دینی ریاست میں ادیب کو پہلے اپنے دین میں صادق ہونا اور پھر اپنی صداقت کو اپنے ادب میں تخلیق کرنا ہو گا۔

اب باطنی صداقت کی بات چلی ہے تو ایک ضروری بات کرتا چلوں۔ اپنے وجود میں کسی صداقت کو حاصل کرنا دشوار ترین کام ہے۔ اتنا دشوار کہ ایک ادیب کے بقول لوگ اس سے بچنے کے لیے قومی جنگوں میں شریک ہو کر جان دے دیتے ہیں۔ ادیب معاشرے کے ہر طبقے سے زیادہ اس دشوار کام کا بیڑا اٹھاتا ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ باطنی صداقت کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ اپنی بات کہنے میں، میں اپنی مدد کے لیے ایک بار پھر اقبال کو آواز دیتا ہوں۔ اقبال اسلام کے کتنے بڑے داعی تھے، یہ آپ سب کو معلوم ہے اور ہم ادیبوں کے لیے تو بڑوں کے بھی بڑوں میں شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے بارے میں مختلف اوقات میں کچھ باتیں کہی ہیں۔ ان میں سے تین میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا وہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری

مرا دل مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

ان تینوں اشعار میں جو تین باتیں کہی گئی ہیں، وہ آپ کے سامنے ہیں۔ ان سے ایک پوری صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ اقبال کو احساس ہے کہ کچھ معاملات میں ان کا کردار ان کی گفتار کا ساتھ نہیں دیتا۔ انھیں یہ بھی احساس ہے کہ ان کی دانش اور ایمان پر کچھ ایسے اثرات پڑے ہیں جو مطلوب نہیں ہیں اور تیسری بات یہ ہے کہ بہت سے معاملات میں ان کے ذہن میں تشکیک اور یقین کے درمیان کشمکش موجود ہے۔ ان میں سے ایک بات کا تعلق اخلاقیات سے ہے اور باقی دو باتوں کا عقائد اور دیگر فکری اور ایمانی مسائل سے۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص جس کی اخلاقی صداقت پوری اخلاقی صداقت نہ ہو اور جو یقین اور گمان کی کشمکش میں مبتلا ہو، اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس سوال کا صرف ایک جواب ہے۔ اسے اپنی باطنی صداقت کا اظہار کرنا چاہیے۔ کیونکہ باطنی صداقت حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔۔۔ اپنے تجربے کی حقیقت کو تسلیم کرنا۔ یہ سچے ادب اور سچی دینی زندگی دونوں کے لیے لازمی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری دینی ریاست میں سچے ادب کو یہ آزادی حاصل ہوگی۔

(بشکریہ: ماہ نامہ نئی نسلیں، کراچی، جون ۱۹۷۹ء)

*****